CHILDREN'S BOOK TRUST
NEW DELHI

یاد کیجیے

بپن چندر پال

جگدیش چندر بوس

کستوربا گاندھی

وٹھل بھائی پٹیل

رفیع احمد قدوائی

ونوبا بھاوے

شیاما پرساد مکرجی

ہومی بھابھا

یاد کیجیے

ہمارے رہنما

(8)

مترجم : صفدر نقوی

چلڈرن بک ٹرسٹ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان بچوں کا ادبی ٹرسٹ

انگریزی ایڈیشن : 1998
اُردو ایڈیشن : 2000
دوسری طباعت : 2011
تعدادِ اشاعت : 1000
© چلڈرن بک ٹرسٹ، نئی دہلی۔
قیمت : 45.00 روپے

The Urdu edition is published by the National Council for Promotion of Urdu Language, M/o Human Resource Development, Department of Higher Education, Farogh-e-Urdu Bhawan, FC-33/9, Institutional Area, Jasola, New Delhi-110025, by special arrangement with Children's Book Trust, New Delhi and printed at Indraprastha Press (CBT), New Delhi.

Sale Section: National Council for Promotion of Urdu Language, West Block-8, R.K. Puram, New Delhi-110066

بپن چندر پال

انیتا مہاجن

"خالص مذہبی اعتبار سے، ذاتی طور پر، میں نہ ہندو ہوں نہ مسلمان۔ لیکن اگر تھوڑے وسیع نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو میں ایمانداری سے دعویٰ کر سکتا ہوں کہ میں ہندو بھی ہوں اور مسلمان بھی"

☆

"ہمارا سوراج نہ ہندو ہوگا نہ مسلمان۔ یہ ہندوستانی سوراج ہوگا۔"

بپن چندر پال

بپن چندر پال

بپن چندر پال ہندوستان کی سیاسی زندگی میں روشنی کا مینار تھے۔ انھوں نے پچاس سال سے زیادہ عوامی بھلائی کے کام کیے۔ وہ ہندوستان کے عظیم رہنماؤں میں سے ایک تھے۔ ہندوستان کو ایک قوم مانتے تھے اور سماج کی برائیوں کو دور کرنا چاہتے تھے۔ شری آربندو گھوش نے انہیں ہندوستان کی قومی تحریک کا پیغمبر کہا ہے۔ بپن چندر لوگوں کو بہت پہلے سے مکمل آزادی کی اہمیت سمجھا رہے تھے۔ کانگریس نے تو مکمل آزادی کا فیصلہ کافی بعد میں کیا تھا۔ انھوں نے انگریزوں کی پرامن اور خاموشی کے ساتھ مخالفت کو اپنایا چنانچہ وہ شروع سے ہی برطانیہ سے آنے والے سامان کا بائیکاٹ کرنے کے حق میں رہے۔ قومیت کے سلسلے میں بھی ان کے خیالات بہت صاف تھے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ پوری دنیا ایک انسانی برادری ہے اور ہندوستان اس کا ایک حصہ ہے۔

بپن چندر ذاتی آزادی کو بہت اہمیت دیتے تھے۔ اس وقت سماج میں بہت سی برائیاں جڑ پکڑ چکی تھیں۔ چھوت چھات، بچپن کی شادی، اور ستی کا رواج تھا۔ وہ سماج کو ان برائیوں سے پاک کرنا چاہتے تھے۔ انھوں نے غریبوں اور مزدوروں کی حالت کو بہتر بنانے کی کوشش کی۔ انیسویں صدی ہندوستان میں نشاۃ ثانیہ (نئی زندگی) کی تحریک کا زمانہ تھا اور بپن چندر اس کے رہنماؤں میں سے ایک تھے۔ ان کی زندگی بڑی سادہ اور صاف ستھری تھی اور وہ اسے لوگوں کے لئے ایک مشعل راہ بنا کر پیش کرنا چاہتے تھے۔

ابتدائی زندگی

بپن چندر نومبر 1858 کو اپنے آبائی گاؤں پوئل میں پیدا ہوئے۔ پوئل ضلع سلٹ میں ہے۔ (آج کل سلٹ بنگلہ دیش میں ہے۔) ان کے دادا، پردادا، پچیس نسلوں سے اس گاؤں میں رہتے آئے تھے۔ ان کے والد رام چندر ایک چھوٹے زمیندار تھے۔ ان کی گاؤں میں بہت عزت تھی۔ رام چندر نے انگریزی تعلیم حاصل نہیں کی تھی لیکن فارسی کے عالم تھے۔ وہ مضبوط ارادے کے آدمی تھے۔ حالانکہ ویشنو تھے لیکن اسلامی تعلیمات کا ان پر کافی اثر تھا۔

بپن چندر کی والدہ کا نام نرائن دیوی تھا۔ وہ سنجیدہ مزاج خاتون تھیں اور ان میں خود اعتمادی تھی۔ ڈسپلین کو پسند کرتی تھیں۔ بپن کی ایک بہن تھی جس کا نام کرپا تھا۔

چانکیہ کا قول تھا کہ بچے کو پانچ سال کی عمر تک بہت پیار سے رکھنا چاہیے، پھر اگلے دس سال اسے سخت ڈسپلن میں رکھا جائے، سولہ سال کی عمر میں باپ کو چاہیئے کہ اس سے دوست جیسا برتاؤ کرے۔ بپن کے والد رام چندر نے چانکیہ کے قول پر پوری طرح عمل کیا اور اپنے بیٹے کی اچھی تربیت کی۔

چھ سال کی عمر تک بپن کو بڑے پیار اور عزت کے ساتھ پالا گیا۔ ان کی ہر خواہش پوری کی جاتی تھی۔ کوئی بپن کو ڈانٹ بھی نہ سکتا تھا۔ رام چندر کسی دوسرے کو نہ ڈانٹنے دیتے تھے لیکن خود اس پر عمل نہ کرتے تھے کبھی کبھی ڈانٹ بھی لیتے تھے۔

بپن چندر کافی سخت مذہبی ماحول میں پلے بڑھے۔ ان کے والد پوجا کے لئے بیٹھتے تو کوئی ان سے بات نہ کرسکتا تھا۔ بپن ان کی پوجا کے سامان کو چھو بھی نہ سکتے تھے۔ ان کی والدہ بھی پوجا سے پہلے کچھ کھاتی پیتی نہ تھیں۔ لیکن بارہ سال کی عمر میں انہیں پوجا میں شریک ہونے کی اجازت دے دی گئی۔

بپن چندر کو اسکول کے زمانے میں کچھ ہی چیزیں میسر تھیں۔ ان کے پاس بس ایک پتلون اور ایک کوٹ تھا۔ سال میں ایک جوڑا جوتا ملتا تھا۔ لیکن یہ جوتے عام طور پر پانچ چھ مہینے میں ٹوٹ جاتے تھے۔ باقی دن انہیں ننگے پیر اسکول جانا پڑتا تھا۔

پرانے زمانے کے کٹر ہندو نئی اور انگریزی انداز کی تعلیم کے خلاف تھے۔ چنانچہ پرانے اور نئے خیالات میں ٹکراؤ پیدا ہوا۔ اس ٹکراؤ کا بنِ پر بھی اثر پڑا۔ انھیں اسکول سے اٹھا لیا گیا۔ ان کے والد کا خیال تھا کہ اسکول کی تعلیم انھیں مذہب سے دور کر رہی تھی۔ بہت سمجھانے کے بعد انھیں دوبارہ اسکول میں داخلے کی اجازت ملی۔

اس زمانے میں بنگال میں نئی نئی باتیں ہو رہی تھیں۔ ہندو کٹرپن پر اعتراض ہونے لگے تھے۔ اسی زمانے میں کیشب چندر سین نے برہمو سماج کی بنیاد ڈالی جو نئے خیالات کے نوجوانوں کے لئے ایک پناہ گاہ بن گیا۔ باہمت لوگ کٹر رسموں اور رواجوں پر اعتراض کرنے لگے بنِ ابھی انٹرینس سے پہلے کی کلاس میں تھے کہ ان کی ملاقات سندری موہن داس سے ہوئی۔ وہ کلکتے کے پریسی ڈنسی کالج میں پڑھتے تھے۔ اور چھٹیاں بتانے گھر آئے تھے۔ سندری موہن برہمو سماجی ہو چکے تھی۔ ان سے تعلقات بڑھے اور یہ تعلق زندگی بھر کا رشتہ بن گیا۔ سندری موہن نے انھیں اس دور کے ادب میں نئے خیالات سمجھنے میں مدد دی۔ بنِ چندر نے نظمیں لکھنی شروع کیں جو اخباروں میں چھپیں۔

کالج میں

بنِ چندر نے کلکتہ یونیورسٹی سے انٹرنس کا امتحان پاس کیا اور اس کے ساتھ ان کی اسکولی تعلیم ختم ہو گئی۔ اب وہ اعلیٰ تعلیم میں داخلہ لے سکتے تھے۔ شہر میں ان کا دم گھٹنے لگا۔ یہ شہر انھیں پکے مکانوں کا ایک جنگل معلوم ہوتا تھا۔

بنِ کو حکومت کی طرف سے دس روپئے مہینے کا وظیفہ ملا اور انھوں نے 1875 میں پریسی ڈنسی کالج میں داخلہ لے لیا۔ ان کے ساتھی بڑے قابل لوگ تھے جیسے۔ بھوپندر ناتھ بسو، جو آگے چل کر انڈین نیشنل کانگریس کے بڑے لیڈر بنے۔ ہیرا مہا چندر موترا مشہور عالم تھے، وہ آگے چل کر سٹی کالج کے پرنسپل بھی ہوئے۔

پرنسپل سٹکلف ڈسپلن کے معاملے میں کافی سخت تھے اور شروع شروع میں بنِ پابندی سے ان کی کلاسوں میں حاضر رہتے تھے۔ انھیں اپنے ٹیچر پیارے چرن سرکار سے بہت

لگاؤ تھا۔ بپن نے کالج کے زمانے میں کوئی قابل ذکر کام نہ کیا۔ بعد میں تو وہ کلاس میں بھی کبھی کبھی نظر آتے تھے۔ انہوں نے اپنی خود نوشت سوانح عمری میں لکھا ہے۔ "میں ایک دو گھنٹے ہی کلاس میں بیٹھتا تھا۔ اور کبھی کبھی تو بس ایک گھنٹے ہی۔۔ باقی گھنٹے پار کرتا تھا۔" ان کے خیال میں وقت کا بہترین استعمال کتابیں پڑھنا تھا۔

بپن چندر گرمی کی چھٹیوں میں سلہٹ گئے۔ وہاں انھیں ایک کے بعد ایک کئی صدمے جھیلنے پڑے۔ ان کی بہن کا انتقال ہوا۔ بچی کی عمر ڈھائی سال کے قریب تھی، اس نے بپن کی گود میں دم توڑا۔ ان کی والدہ اس صدمے کو برداشت نہ کر سکیں۔ چند دن میں وہ بھی چل بسیں۔ شرادھ کی رسم ادا ہونی تھی۔ ان کے والد کو اتنا صدمہ تھا کہ وہ سفر کے قابل نہ رہے۔ اس لئے بپن کلکتہ گئے اور کالی گھاٹ پر اپنی والدہ کی آخری رسوم ادا کیں۔

1876 میں وہ سخت بیمار ہو گئے۔ چکن پاکس کی بیماری تھی۔ امتحان قریب تھا۔ سندری موہن کلکتے کے میڈیکل کالج میں پڑھتے تھے۔ انہوں نے بپن کی تیمارداری کی۔ بپن ٹھیک ہوئے تو سندری موہن بیمار ہو گئے۔ اب تیمارداری کی باری بپن کی تھی۔ امتحان ختم ہو چکا تھا۔ وہ پڑھنے لکھنے کے لئے کلکتے میں رہنا چاہتے تھی۔ لیکن ان کے والد نے انہیں گھر بلایا۔ اور وہ مجبوراً سلہٹ چلے گئے۔

بپن چندر نے گیارہویں کلاس کا امتحان کلکتہ مشن کالج میں دیا تھا جس میں وہ حساب میں فیل ہو گئے۔ ان کے والد کٹر مذہبی تھے۔ ان کے اور بپن کے بیچ مذہب کے معاملے میں اختلاف شروع ہوا۔ وہ بیٹے سے ناراض ہو گئے۔ چھ مہینے تک خرچ دینا بند کر دیا۔ اس عرصے میں بپن بہت پریشان رہے۔

1875 سے 1878 تک بپن نے پریسی ڈنسی کالج میں تعلیم حاصل کی۔ یہ زمانہ ان کے لئے بہت اہم رہا۔ اسی زمانے میں ملکی اور قومی معاملات ان کی سمجھ میں آئے۔ مدھوشدن دت اور بنکم چندر چٹرجی کے ادب کے سلسلے کے خیالات سے وہ بہت متاثر ہوئے۔ ان خیالات کے ساتھ برہمو سماج کے پیدا کیے ہوئے مذہبی اور سماجی آزادی کے خیالات اور قومیت کے معاملے میں سریندر ناتھ بنرجی کے سوچنے کے ڈھنگ نے ان کی زندگی پر بڑا گہرا

اثر ڈالا۔ بنرجی بپن کے سیاسی گرو تھے۔ ان کے خیالات سے ہی متاثر ہو کر بپن نے سیاست میں حصہ لینا شروع کیا۔ پھر بھی ان کی زندگی کا زیادہ اہم حصہ برہمو سماج مشن کے کاموں میں گزرتا تھا۔

کالج کی تعلیم کے زمانے میں انھوں نے مضامین لکھے۔ یہ مضامین بنگالی زبان کے "سری ہٹا" اور "پرکاش" رسالوں میں چھپے۔ بائیس سال کی عمر میں بپن نے "پری درشک" نامی ہفتہ وار اخبار شروع کیا۔ یہ اخبار انھوں نے بنگالی زبان میں سلہٹ سے نکالا تھا 74-1873 میں بنکم چندر چٹرجی نے "بنگادرشن" نام سے ایک رسالہ شائع کرنا شروع کیا۔ اس رسالے نے بپن کے ملکی اور قومی خیالات کو بہت متاثر کیا۔

برہمو سماج

برہمو سماج کے دعائیہ جلسے ہر ہفتے ہوتے تھے۔ بپن چندر اپنے دوست سندری موہن کے ساتھ بڑی پابندی سے ان جلسوں میں شریک ہوتے تھے۔ وہ خاموشی سے بیٹھے کیشب چندر سین کی تقریر سنا کرتے۔ وہ برہمو سماج کے اصولوں سے بہت متاثر ہوئے لیکن سماج کے باقاعدہ ممبر کبھی نہ بنے 1876 میں ان کی ملاقات شیو ناتھ شاستری سے ہوئی۔ شاستری سنسکرت کے عالم تھے ان کے برہمو خیالات میں رائے کی آزادی اور انفرادیت زیادہ تھی۔ سماج اور ملک کی آزادی کو شیوناتھ بہت اہمیت دیتے تھے۔ ساتھ ہی وہ ہر بات کو عقل کی کسوٹی پر بھی کستے تھی۔ ان خیالات سے متاثر ہو کر بپن اور کچھ دوستوں نے مل کر ایک چھوٹی سی سوسائٹی بنائی، جس کا مقصد سماجی برائیوں کو دور کرنا تھا۔

شیوناتھ شاستری اور کچھ دوسرے نوجوان "برہمو" لوگوں نے مل کر سادھارن برہمو سماج کی بنیاد ڈالی۔ بپن چندر کیشب چندر سین کی پرجوش تعلیمات کے مقابلے میں شاستری کے خیالات سے زیادہ متاثر ہوئے۔ بپن چندر نے اپنے والد کو اطلاع نہیں دی کہ وہ ہندو کٹرپن سے الگ ہو گئے ہیں لیکن انھیں کسی طرح اس کا پتہ چل گیا۔ 1877 میں ان کے والد نے انھیں واپسی کا حکم دیا لیکن وہ وہاں جانا برابر ملتوی کرتے رہے۔ ان کے والد

نے انہیں روپیہ بھیجنا بند کر دیا۔ کچھ دن بعد ان کے والد نے دوسری شادی کرلی۔ اس کے بعد انہوں نے بپن کو روپیہ تو بھیج دیا لیکن اپنے ورثے سے محروم کر دینے کے خط کے ساتھ۔

بپن ایف۔ اے۔ پاس نہ کرسکے اور ان کے والد نے انہیں عاق کر دیا (اولاد کے حق ختم کر دیے)۔ بپن نے اب بنگال سے باہر زندگی شروع کی۔ 1878 میں وہ اڑیسہ کی کٹک اکادمی میں ہیڈ ماسٹر ہو گئے۔ وہ پرنسپل کی حیثیت سے زیادہ دن کام نہ کرسکے اور اسی سال نومبر میں استعفیٰ دے دیا۔

بپن کلکتہ واپس آگئے۔ انہیں سلٹ یونین نے سلٹ آنے پر راضی کیا اور وہ اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ سلٹ پہنچے اور وہاں ایک ہائی اسکول شروع کیا، جس کا نام سلٹ نیشنل اسکول رکھا گیا اس کی ابتدا بپن چندر نے جنوری 1889 میں کی۔ اچھے انتظام کی وجہ سے اسکول نے بہت ترقی کی۔ ساتھ ہی وہ سادھارن برہمو سماج کے اصلاحی کاموں میں بھی لگے رہے۔ پری درشک کی اشاعت بھی چلتی رہی۔

یہ وقت بپن کے لئے بہت سخت تھا۔ ان کے والد سختی سے چاہتے تھے کہ وہ برہمو سماج سے تعلق ختم کر دیں۔ انہوں نے ان کا نام بھی اپنی وصیت میں سے کاٹ دیا۔ لوگوں کے بہت کہنے سننے سے انہوں نے بپن کو سو روپئے مہینہ دینا قبول کرلیا۔

بپن کو پھیپڑے کی بیماری لگ گئی۔ انہوں نے سلٹ چھوڑ دیا اور کلکتہ چلے گئے کیونکہ وہاں کی مرطوب آب وہوا ان کی صحت کے لئے مناسب نہ تھی۔ انہیں ٹھیک ہونے میں ایک سال لگ گیا۔ سندری موہن نے ان کے والد سے ان کے لئے مالی امداد کی اپیل کی لیکن مالی امداد نہ مل سکی۔

بپن چندر 1881 میں بنگلور میں آرکوٹ نرائنا سوامی مدلیار اسکول کے ہیڈ ماسٹر مقرر ہوئے۔

بپن چندر نے دسمبر 1881 میں نرتیاکلی دیوی سے بمبئی میں شادی کی۔ ان کی بچپن میں شادی ہوئی تھی لیکن وہ بیوہ ہو گئی تھیں۔ وہ اپنی نئی دلہن کے ساتھ ایک سال بعد کلکتہ واپس آئے۔

بپن چندر کو یقین تھا کہ ہندوستان میں، انگلستان کے مقابلے میں، عورت کی حالت بہت بہتر ہے۔ ہندوستان میں مردوں کو سکھایا جاتا ہے کہ وہ ہر عورت کا ماں کی طرح احترام کریں۔ گوکہ ہندوستان میں عورت براہ راست یا سیدھے طور پر سیاست میں حصہ نہیں لیتی مگر اسے بالواسطہ متاثر ضرور کرتی ہے۔ وہ انگلینڈ کی عورتوں جیسی تعلیم یافتہ نہیں ہوتی لیکن کردار میں، مذہبی اور سماجی معاملات میں وہ ان سے برتر ہوتی ہے۔ 1883 میں بپن کو کلکتے میں پتہ چلا کہ ان کے والد بیمار ہیں۔ بپن نے فوراً ہی وہاں جانے کا فیصلہ کرلیا۔ والد نے بپن کو اپنی جائداد وغیرہ کا متولی (ٹرسٹی) بنادیا۔ یہ وصیت کرنے کے چند گھنٹے بعد ہی ان کا انتقال ہوگیا۔ بپن نے اپنے والد کی چھوڑی ہوئی جائداد کا انتظام کرنے کی کوشش تو کی لیکن زمینداری کے طور طریقوں سے ان کا مزاج میل نہیں کھاتا تھا۔ پھر ان کی بیوی اور بچے پوئل کی مرطوب آب و ہوا میں بیمار رہنے لگے اس لیے 1886 کے درمیانی حصے میں وہ کلکتہ واپس آگئے۔

تصنیفات

بپن چندر میں لکھنے کی صلاحیت قدرت کی بہت بڑا عطیہ تھی۔ وہ نوٹس اور حوالے کی کتابوں کے بغیر لکھتے تھے۔ ان کی غیر معمولی ذہانت کا ان کی تصنیفات سے پتہ چلتا ہے۔

انگریزی کے ایک ہفتہ وار اخبار "بنگال پبلک اوپینین" میں بپن نے 1883 میں نائب ایڈیٹر کی حیثیت سے کام کیا۔ اصل میں تو وہ اڈیٹر کا پورا کام سنبھالتے تھے۔ اس میں شائع ہونے والے بہت سے مضامین بھی وہ ہی لکھتے تھے۔

یہ زمانہ ہندو کٹرپن اور ترقی پسند تحریکوں کے آپسی ٹکراؤ کا زمانہ تھا۔

بپن چندر نے 1884 میں "آلوچنا" نام کا ایک ماہانہ رسالہ شروع کیا۔ اس میں ہندو مذہب کے پرانے خیالات اور برہمو سماج کے نظریات میں کچھ قربت اور ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اس رسالے میں بہت بڑے بڑے لوگوں کے مضامین شائع ہوتے تھے۔ شیوناتھ شاسری، وریجیندر ناتھ ٹیگور، اور رابندر ناتھ ٹیگور جیسے لوگ اس میں لکھنے والوں میں

سے تھے۔ پال نے اس رسالے میں سیاسی، سماجی اور تاریخی مضامین کو نئے عقلی انداز میں پیش کیا اور ان باتوں کو عوام تک پہنچانے کے لئے اسے استعمال کیا۔ اور اس کا لوگوں پر اثر بھی پڑا۔

1887 میں بپن چندر نے لاہور کے اخبار "ٹریبیون" کی نائب مدیر کی جگہ قبول کرلی۔ اس کے مدیر ستیش کانت چٹرجی چھٹی پر گئے تو انہوں نے اکیلے ہی اسے سنبھالا۔ وہ پورا اخبار خود ہی لکھ لیتے تھے سوائے خبروں کے جو نائب مدیر بناتے تھے۔ پال لاہور کے سمجھدار لوگوں کے درمیان خاصے مشہور ہوگئے۔ لیکن وہ وہاں بھی زیادہ دن نہ رک سکے اور 1888 میں انھوں نے لاہور چھوڑ دیا۔ 1890 میں ان کی بیوی نرتیاکلی دیوی کا انتقال ہوگیا۔ ایک سال بعد بپن نے پھر ایک بیوہ سے شادی کرلی۔ ان کا نام بیرج موہن دیوی تھا۔ یہ سریندر ناتھ بنرجی کی دور کی رشتے دار تھیں۔ دونوں بیویوں سے بپن کے تین لڑکے اور پانچ لڑکیاں تھیں۔

1892 میں بپن چندر پال نے بنگالی زبان میں "آشا" نام کا ماہنامہ شروع کیا۔ دو سال بعد 1894 میں انھوں نے "کومودی" نامی بنگالی پندرہ روزہ اخبار شروع کیا۔

1898 میں بپن چندر پال مذہبیات کے مطالعے کے لئے انگلستان گئے۔ انہیں اس کے لئے "انگلستان اور فارن یونیٹیرین ایسوسی ایشن" نے وظیفہ دیا تھا۔ انھوں نے ایک سال بعد وظیفہ چھوڑ دیا اور انگلستان میں ہندو مذہب اور سیاسی پروپیگنڈہ میں لگ گئے۔ "نیویارک نیشنل ٹمپرینس ایسوسی ایشن" کی طرف سے لکچر دینے کے لئے یو۔ ایس۔ اے۔ کا سفر کیا اور پھر 1900 میں وہ زبردست قوم پرستی کا جذبہ لئے ہندوستان واپس آگئے۔ اور آزادی کی جدوجہد میں کود پڑے۔

جریدے

بپن چندر پال نے 12 اگست 1901 کو ایک انگریزی ہفتہ وار رسالہ نکالا، جس کا نام "نیوانڈیا" تھا۔ اس کا مقصد تعلیمی نظام کو بہتر بنانا تھا۔ اس کے علاوہ سیکولر تہذیب کو فروغ

دینا بھی اس کے مقاصد میں شامل تھا۔ بنگال کو 1905 میں تقسیم کیا گیا۔ اس سے وہ اس نتیجے پر پہنچے کے معتدل طریقہ فکر "بالکل ناکام" ہوگیا تھا۔ اس زمانے میں کرشن کمار مترا ایک بنگالی جریدہ سنجیونی نکالتے تھی۔ سب سے پہلے اسی میں انگلش سامان کے بائیکاٹ کی تجویز شائع ہوئی۔

بنگال کی صوبائی کانفرنس 14، 15 اپریل 1906 کو باری سال میں منعقد ہوئی۔ اس میں اعتدال پسند، انتہاپسند اور انقلابی سب ہی شریک ہوئے۔ اس کانفرنس کا مقصد تھا کہ یہ ظاہر ہوجائے کہ سب قسم کے لوگ متحد ہیں۔ جلوس میں لوگ "بندے ماترم" کے نعرے لگارہے تھے۔ پولیس نے ان کی پٹائی کی۔

بپن چندر پال نے "بندے ماترم" نام کا ایک اخبار نکالا اس کے خرچ کے لئے ان کے ایک دوست نے 500 روپئے کا عطیہ دیا تھا۔ بندے ماترم کا پہلا شمارہ 6 اگست 1906 کو منظر عام پر آیا۔ اس پرچے کی اشاعت کو ایک ہفتہ ہی ہوا تھا کہ بندے ماترم کا نعرہ ہندوستان اور باہر بھی گونجنے لگا۔ پرچہ اتنا مقبول ہوا کہ اسے ایک مشعلہ بیان اشاعت، جس نے ہندوستانی اخبار نویسی کو نیا انداز دیا۔۔۔ اور ہندوستان میں انتہاپسند اخبار نویسی کی سب سے موثر آواز" مانا جانے لگا۔

بپن چندر پال نے قوم پرستی کا پرچار شروع کیا، اسی طرح جیسے رابندر ناتھ ٹیگور اور اربندو گھوش کا طریقہ تھا۔

بپن چندر پال نے لندن سے انگلش ہفتہ وار "سوراج" نکالا انگلش ماہنامہ "ہندو ریویو 1912 میں شروع کیا۔ موتی لال نہرو کے شروع کئے ہوئے اخبار "انڈی پنڈنٹ" اور ہفتہ وار "ڈیماکریٹ" کے اڈیٹر رہے۔ (20_1919) اور سریندر ناتھ بنرجی کے شروع کئے "بنگالی" کے بھی ایڈیٹر رہے۔ (25_1924) وہ ماڈرن ریویو، امرت بازار پتر ا، سٹیٹسمین اور انگلش مین" میں برابر لکھتے رہے۔

ایک شام بپن امرت بازار پترکا کے دفتر گئے اس وقت بابو موتی لال گھوش اڈیٹر تھے۔ انہوں نے پال سے کہا کہ کیا تم آج کے کسی تازہ مسئلے پر ابھی ایک مضمون لکھنا پسند

کروگے۔؟ پال تو وہاں اپنے ایک دوست سے ملنے گئے تھے، لیکن انہوں نے انکار یہ کیا۔ انہوں نے اسی وقت اس دن کے مسئلے پر ایک مضمون بول کر لکھوا دیا انہیں اس میں صرف 45 منٹ لگے۔ وہ مضمون اخبار میں اڈیٹوریل کے طور پر چھپا۔

بپن چندر پال نے اخبار نویسی آخری وقت تک جاری رکھی۔ اپنی موت سے ایک دن پہلے انہوں نے سوراج اور وفاق کے عنوان پر ایک مضمون بول کر لکھوایا تھا۔

یہ مضمون مدراس کے ایک اخبار کے لئے لکھا تھا۔ اور اس شرط پر لکھا تھا کہ اس میں کوئی ترمیم نہ کی جائے گی۔

ایک محب وطن اخبار نویس کی حیثیت سے وہ چترنجن داس کے بنگالی رسالے "نرائن" سے بھی تعلق رکھتے تھے۔ اور اس کے خاص لکھنے والوں میں سے تھے۔ اس زمانے کے مشہور رسالوں "بنگادرشن" اور "سوجیہ" کے دوبارہ شروع کرنے میں بھی ان کا ہاتھ تھا۔

بپن چندر پال 1913 کے بعد تقریباً سب ہی رسالوں میں ایک آزاد قلم کار کی حیثیت سے لکھتے رہے۔ ان کے بہت سے مضامین ہندوستان، امریکہ اور یورپ میں بھی چھپے تھے۔ مضامین اہم حالات حاضرہ پر ہوتے تھے اور ان میں ان کی انفرادیت کی جھلک ملتی تھی۔ ایک ملک میں جس کی صرف پانچ فیصدی آبادی پڑھی لکھی ہو اخبار نویسی پر گزارہ کرنا مشکل تھا۔ لیکن پال اس میں کامیاب رہے۔ 1907 میں بپن چندر جنوبی ہندوستان کے دورے پر گئے۔ مدراس میں مئی 1907 میں ان کے لکچر یادگار لکچر تھے۔

26 مئی 1907 کو بپن ایک عدالت میں طلب کئے گئے۔ جج چاہتا تھا کہ بندے ماترم، کے اڈیٹر کی حیثیت سے وہ اربندو گھوش کی شناخت کریں۔ انہوں نے کسی بھی سوال کا جواب دینے سے انکار کر دیا۔ چنانچہ انہیں چھ مہینے کی قید کی سزا دی گئی۔

انگریز قومی تحریک کو کچل دینا چاہتے تھے۔ اس مقصد سے انہوں نے جوانوں اور قوم پرست لیڈروں سے جیلوں کو بھر دیا۔ اس کے نتیجہ میں پریس پر سخت پابندی لگا دی گئی۔

مکمل انسان

1896 کے قریب بپن چندر پال نے "کرشن چرتر" لکھی۔ یہ بنگالی ادب کی مشہور کتاب ہے۔ جو کچھ روایتی ریکارڈ موجود ہے اس کے باضابطہ تجزیہ سے "کرشن چرتر" میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ "کرشن ایک مکمل انسان تھے۔ جس طرح رامائن میں رام ہیں اسی طرح سری کرشن بھی قابل احترام ہیں۔

بپن چندر پال نے بنگالی میں "سری سری کرشنا تتو کے عنوان پر بہت سے مضامین لکھے۔ ان کے تصور میں سری کرشنا حقیقت کی آخری منزل ہیں۔

آخری دنوں میں بپن چندر پال اکثر "چیتنیہ چرت امریتا" پڑھتے تھے۔ یہ کتاب بنگال کے ویشنو لوگوں کی ہے اور چیتنیہ کی زندگی کے گرد گھومتی ہے۔

بپن چندر پال نے رادھا اور کرشن کی محبت پر بہت سے مضامین لکھے۔ یہ مضامین ان کی محبت کے مختلف انداز (موڈ) پر مشتمل ہیں۔ ان کی بنیاد ویشنو گانے ہیں۔ 1911 میں انھوں نے "ہندوستان کی روح" نامی کتاب لکھی۔

پال نے حضرت عیسیٰ کے پیغام اور مشن پر بھی مضامین لکھے ہیں۔ یہ مضامین عیسائیت کے بارے میں ان کے پختہ خیالات کو ظاہر کرتے ہیں۔ وہ اس سے متفق تھے کہ عیسائی تخیل کے مطابق عیسیٰ ایک زندہ قوت ہیں۔ وہ موجودہ زمانے کے بارے میں راجہ رام موہن رائے کے خیالات سے متفق تھے۔ خاص طور پر اپنے مضمون "عیسیٰ کے ادراک کے بارے میں ۔۔۔ "امن اور خوشی کے سلسلے میں کیشب چندر سین کے پیرو تھے۔ خاص طور پر برہمو سماج کے لیڈر کی حیثیت سے وہ تقریریں جو انھوں نے عیسیٰ کے بارے میں یورپ اور ایشیا میں کی تھیں۔

بپن چندر پال مذہبوں کو ایک دوسرے کے ساتھ رکھ کر دیکھتے تھے۔ وہ عیسائیوں کے اس دعوے کو صحیح نہیں مانتے تھے کہ عیسائیت پوری کائنات پر محیط ہے۔ ان کا خیال تھا کہ کائنات کا احاطہ ہندو مذہب ہی کر سکتا ہے۔

لوک مانیہ تلک اور لالہ لاجپت رائے کے ساتھ بپن چندر پال کانگریس کے انتہا پسند گروپ کے لیڈر تھے۔ وہ بڑی کامیابی کے ساتھ اعتدال پسندوں کا مقابلہ کرتے تھے۔ یہ لوگ برسوں تک کانگریس پر چھائے رہے اور نوجوانوں پر اثرانداز رہے۔ یہ زمانہ صحیح طور پر لال، بال اور پال کا زمانہ کہلاتا ہے۔

کانگریس میں

بپن چندر پال 1886 میں کانگریس میں شامل ہوئے تھے۔ انہوں نے اگلے سال مدراس میں پہلی تقریر کی تھی۔ اس تقریر میں آرمس ایکٹ کو واپس لینے کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ ان کی تقریر تالیوں کی گونج میں سنی گئی۔ جو وقت تقریر کے لئے انہیں دیا گیا تھا اس کے بعد بھی لوگ تقریر جاری رکھنے کا مطالبہ کرتے رہے۔ ایک مقرر کی حیثیت سے کچھ لوگ ہی ان کی برابری کرسکتے تھے۔ انہیں صحیح طور پر "ہندوستان کا برکے" کہا جاتا تھا۔

وی۔ ایس۔ سری نواس ساستری نے لکھا تھا "بابو بپن چندر پال نے مدراس میں نئی سیاسی نسل کے مبلغ کی حیثیت سے اعلی صلاحیت دکھائی۔" بہت دن تک وہ سمندر کے ساحل کی ریت پر تقریر کرتے رہے۔ یہ تقریریں جذباتی تو ہوتی ہی تھیں لیکن پوری مدلل بھی ہوتی تھیں۔ وہ سننے والوں کے دلوں کو موہ لیتی تھیں۔ ہندوستان میں ایسی تقریروں کا تصور مشکل ہے۔"

اکتوبر 1891 میں بنگال کی صوبائی کانفرنس کے موقعے پر بپن نے اس میں آسام کے چائے مزدوروں کے بارے میں تجویز پر بہت زوردار تقریر کی۔ تجویز میں حکومت سے مطالبہ کیا گیا تھا کہ وہ مزدوروں کی سپلائی کی ٹھیکے داری کے قانون 1859 اور 1882 کو منسوخ کرے۔ 2-1901 میں بھی نیو انڈیا کے صفحات میں مزدوروں کے لئے اپنی فکر کا اظہار کیا۔

1906 میں کانگریس کے اجلاس میں انھوں نے بائیکاٹ کی تجویز کی حمایت کی۔ کلکتے کے اس جلسے کی صدارت دادا بھائی نوروجی نے کی تھی۔ گوپال کرشن گوکھلے نے اس

تجویز پر احتجاج کیا لیکن نیشلسٹ پارٹی اور حاضر ڈیلی گیٹس اس کے زبردست حامی تھے۔ اجلاس کی کارروائی میں پال نے زندگی کی روح پھونک دی۔ قومیت کے مفاد کے زبردست حامی کی حیثیت سے وہ اپنے خول میں سے نکل کر ایک منظم پارٹی کی لیڈر شپ میں شریک ہوئے 1907 کی سورت کانفرنس میں کانگریس کی تقسیم کے بعد بپن دوسرے لیڈروں کے ساتھ کانگرس سے الگ ہوگئے۔ خاموش مخالفت، انگریزی سامان کا بائیکاٹ، غیر ملکی حکومت سے لاتعلقی اور قومی تعلیم ایسے موضوع تھے جن پر بنگال، آسام، یوپی اور مدراس کے دوروں میں پال نے لوگوں کو سمجھایا۔

بپن چندر پال نے گاندھی جی کی عدم تعاون کی تحریک کی مخالفت کی۔ اس کی وجہ اس تحریک کا خلافت کی تحریک سے تعلق تھا۔ ان کا خیال تھا کہ یہ تحریک گاندھی جی پر لوگوں کے اندھے اعتقاد کی دین ہے۔ انہوں نے سی۔ آر۔ داس۔ پر بھی تنقید کی اور ہندوستان کی فرقہ پرستی کے مسئلے پر مولانا محمد علی سے بھی اختلاف کیا۔ وہ زندگی بھر سودیشی کے حمایتی رہے لیکن غیر ملکی کپڑا پہننے کو "گناہ" نہیں سمجھتے تھے۔

بپن یورپ کے ایک مشہور انقلابی شیام جی کرشن ورما کے بلانے پر 20 اگست 1908 کو پھر انگلستان گئے۔ انہوں نے یہ اعلان کردیا کہ وہ انقلابی نہیں انتہا پسند ہیں۔ اس سے یورپ میں مقیم ہندوستانی انقلابی ان سے ناراض ہوگئے۔ ان انقلابیوں کے لیڈر ویر ساورکر تھے۔ مالی مشکلات کی وجہ سے پال کو اپنا قیام مختصر کرنا پڑا وہ نومبر 1911 میں ہندوستان واپس آگئے۔ بمبئی پہنچنے پر جہاز پر ہی انہیں گرفتار کرلیا گیا۔ سوراج، میں "بنگال میں بم پھینکنے کے اسباب" کے عنوان سے ایک مضمون لکھنے پر بغاوت کے الزام میں ان کی گرفتاری ہوئی تھی۔ بپن چندر پال نے اقبال جرم کرلیا۔ اس سے ان کے ساتھی بہت ناامید ہوئے کہ انہیں ایک مہینے کی سزا ہوئی اور بمبئی جیل میں رکھا گیا۔

وسیع النظر

انگلینڈ میں عارضی قیام کے دوران (11-1908) بپن کے ذہن میں ایک سیاسی خیال

پیدا ہوا جسے وہ "سلطنت کا نظریہ" کہتے تھے۔ انہوں نے کہا کہ برٹش سلطنت کو وفاقی بنیاد پر نئے سرے سے منظم کیا جائے، جس میں برطانیہ، ہندوستان اور انگلستان کی دوسری خود مختار نوآبادیاں (کالونیاں) برابری کے ساتھ آزاد حصہ دار کی حیثیت سے شامل ہوں۔ ان کی قوم پرستی نے ایک نیا بین الاقوامی رخ اختیار کیا۔ ان کا کہنا تھا کہ ہندوستان میں بھی مستقبل میں ایک وفاقی حکومت بنی چاہیئے۔ جس میں مختلف علاقے پوری طرح آزاد ہوں اور قومی یکجہتی اور قومی وقار کے ساتھ ترقی کریں۔

ہندوستان واپس آکر بپن چندر پال نے اس خیال کو "ہندو ریویو" کے ذریعے لوگوں تک پہنچانے کی کوشش کی لیکن اس میں کامیاب نہ ہوئے۔

بپن چندر پال 1916 میں اینی بیسنٹ اور بال گنگادھر تلک کی ہوم رول لیگ میں شریک ہوئے۔ اور کانگریس میں واپس آگئے۔

فروری 1919 میں مرکزی قانون ساز کونسل (سنٹرل لیجسلیچر) میں دو راولیٹ بل پیش ہوئے جن کا مقصد قومی تحریک کو دبانا تھا۔ ان بلوں میں کسی بھی شخص کو گرفتار کر لینے اور بلا مقدمہ چلائے سزا دینے کا حق تھا۔ 1919 میں راولٹ ایکٹ کے خلاف عام ستیہ گرہ شروع ہوئی جس کے نتیجے میں بدنام زمانہ جلیان والا باغ کا افسوسناک المیہ ہوا۔ سب جانتے ہیں کہ اس ٹریجڈی کے خلاف مشہور شاعر رابندر ناتھ ٹیگور نے اپنا خطاب واپس کر دیا تھا۔ کانگریس نے طے کیا کہ ایک وفد انگلستان بھیجا جائے جو ہندوستان کا نقطہ نظر ایک جوائنٹ کمیٹی کے سامنے رکھے۔ اس وفد میں بال گنگادھر تلک اور بپن چندر پال شامل تھے۔ پال کا کسی غیر ملک کا یہ آخری سفر تھا۔

باریسال

بپن چندر پال نے بنگال صوبائی کانفرنس کی صدارت کی۔ یہ کانفرنس 1921 کے مارچ کی 25 سے 27 تک باریسال میں منعقد ہوئی تھی۔ اس میں تقریبا 2000 نمائندوں نے شرکت کی جن میں 200 عورتیں بھی تھیں۔ یہ ایک بڑی بات تھی بپن نے اپنے

ہم وطنوں کے سامنے قومی تعمیر کا ایک تفصیلی پروگرام پیش کیا۔

گاندھی جی کی عدم موجودگی کے باوجود یہ کانفرنس آزادی کی جدوجہد کا ایک سنگ میل بن گئی۔

بپن چندر پال نے عدم تعاون کی تحریک کی مخالفت کی۔ انہوں نے کہا ملک کے بہت کم لوگ اس سے متفق تھے۔ پال نے "سوراج" کی جمہوری سوراج کی حیثیت سے تشریح کی۔ انہوں نے کہا کہ یونٹری حکومت، میں جمہوریت پنپ ہی نہیں سکتی۔ انہوں نے دلیل دی کہ یونٹری حکومت ہندوستان کی روایت اور روح کے خلاف ہے۔

اگلے دن (26 مارچ) کو پنڈال کے باہر بہت سے لوگوں نے ایک میٹنگ کی جس میں گاندھی جی کے پروگرام سے متفق نہ ہونے پر پال پر تنقید کی گئی۔ چترنجن داس نے اعلان کیا کہ "سوراج" سوراج ہے اور یہ کسی ایک اسکیم یا طرز حکومت کی وضاحت نہیں کرتا۔ تنقید کرنے والوں نے ان کا اصل مطلب سمجھا ہی نہیں۔ اس کا تعلق روح کی تربیت اور ترقی سے ہے۔ سی۔ آر۔ داس نے حاضرین سے وکالت کی کہ وہ عدم تعاون کے پروگرام کو ویسا کا ویسا ہی بلا جھجک قبول کرلیں۔

بپن چندر پال نے بنگال صوبائی کانفرنس اور آل انڈیا کانگریس کمیٹی سے استعفےٰ دے دیا۔

بپن چندر پال کا خیال تھا کہ ان کا مطلب لوگ غلط سمجھے۔ اب وہ سیاسی اور ادبی طور پر بھی تنہا رہ گئے۔ ہر اخبار ان سے کترانے لگا۔ انہوں نے اپنے خیال کی وضاحت کرنے کی کوشش بھی کی۔ "میرا اختلاف ذاتی نہیں تھا لیکن مہاتما (گاندھی) کے ماننے والوں نے مجھ پر ذاتیات کا الزام لگایا۔"

اس موقع پر بپن چندر پال نے انگریزوں کے روزنامے "انگلش مین" میں کام کرنے کی پیش کش منظور کرلی۔ اس میں انہیں مستقلاً لکھنا تھا "ہندوستان کیا سوچتا ہے۔" اس سے عوام ان سے اور زیادہ ناراض ہوگئے۔

پال اپنے عزیز دوست سی۔ آر۔ داس سے الگ ہوگئے اور ان سے تمام رشتے توڑ لیے۔

سیاسی اختلاف کے علاوہ ایک ذاتی معاملہ بھی آپڑا۔ سی۔ آر۔ داس کی لڑکی کی شادی تھی جو ہندو رسم ورواج کے مطابق ہونی تھی۔ ایک ہریجن کو یہ رسم ادا کرنی تھی۔ مسالگ رام سلا" جسے کٹر ہندو پوجتے ہیں، وہ بھی لایا جانا تھا۔ برہمو سماج کے عقیدے کی وجہ سے بپن چندر پال نے اس کی مخالفت کی اور وہ اس رسم میں شریک نہ ہوئے۔

آخری زمانہ

بپن چندر پال قانون ساز اسمبلی میں 1923 میں کلکتے سے ایک آزاد ممبر کی حیثیت سے منتخب ہوئے۔ تقریباً تین سال بپن چندر نے کلکتے کی نمائندگی کی اور حزب مخالف میں ایک ممتاز جگہ پر بیٹھے۔

اسمبلی میں بپن قوم سے متعلق تمام اہم معاملات پر بولتے رہے۔ ایک مضبوط اور عمر بھر کے باغی پال بائیں بازو کے بھی بائیں بازو سے تعلق رکھتے تھے۔

1924 میں بپن روزنامہ 'بنگالی' کے مدیر اعلیٰ مقرر ہوئے۔ وہ دوسرے اخباروں میں بھی اپنے مضامین دیتے تھے۔ انہوں نے راجا رام موہن رائے کے بعد کے بنگال پر مضامین لکھے۔ ان کی خود نوشت سوانح عمری "ستار تیار" بنگالی روزنامے "پراواسی" میں قسطوں میں 1926 سے 1928 تک شائع ہوئی۔ انگلش سوانح عمری کا پہلا حصہ ان کے انتقال کے بعد چھپ سکا۔

بپن چندر پال نے اپنے خاندان، سماج اور مذہب سے بھی علیحدگی اختیار کرلی تھی۔

اس دوران میں کچھ اہم واقعات رونما ہوئے۔۔۔ سائمن کمیشن کی آمد پر ملک گیر احتجاج (1928)، راوی کے کنارے لاہور سیشن میں پورن سوراج کا نعرہ (1929)، نمک ستیہ گرہ اور ڈانڈی مارچ (1930) سے ملک کے بہت سے حصوں میں عوامی ایجی ٹیشن، لندن میں گول میز کانفرنس (1930 اور 1931)

بپن چندر پال کی زندگی کے آخری دس سال پریشانیوں کے سال تھے۔ مالی مشکلات نے پریشانیوں میں اور اضافہ کردیا تھا۔ یہ ایک بہترین دماغ جس کے کام کو لوگوں نے پسند

نہ کیا، جو اسٹیٹس مین اخبار کے مطابق اپنے گھٹنوں پر جھومتا رہا لیکن اس سب کے باوجود بپن چندر پال کھڑے رہے، تمام عمر اپنے اصولوں کے لئے لڑتے رہے۔ آخری بار وہ 1928 میں لکھنؤ میں کل پارٹی کانفرنس میں لوگوں کے سامنے آئے تھے۔ مگر اب ان کا اثر ختم ہوچکا تھا۔

20 مئی 1932 کو چوہتر سال کی عمر میں، ان کی موت ہوگئی ان کی موت پر کوئی ماتم نہ ہوا۔ انہوں نے آدھی صدی تک عوامی کام کیا تھا۔ اس عرصے میں انھوں نے بنگال کو اور اونچا اٹھایا۔ اور ملک کو ایک نیا سیاسی شعور بخشا۔

بپن چندر میں لکھنے کی صلاحیت قدرت کی بہت بڑا عطیہ تھی۔ وہ نوٹس اور حوالے کی کتابوں کے بغیر لکھتے تھے۔ ان کی غیر معمولی ذہانت کا ان کی تصنیفات سے پتہ چلتا ہے۔

بپن چندر پال نے قوم پرستی کا پرچار شروع کیا، اسی طرح جیسے رابندر ناتھ ٹیگور اور اربندو گھوش کا طریقہ تھا۔

ایک ملک میں جس کی صرف پانچ فیصدی آبادی پڑھی لکھی ہو اخبار نویسی پر گزارہ کرنا مشکل تھا۔ لیکن پال اس میں کامیاب رہے۔

جگدیش چندر بوس

جے۔ شری پلائی

"اگر ہم چاہتے ہیں کہ سائنس کو ترقی دینے والے لوگ پیدا ہوں تو یہ مقصد ہم تعلیم اور امتحان کے مشکل معیار قائم کر کے حاصل نہیں کرسکتے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اپنے ملک میں سائنسی خیالات کو اپنے اندر سمو لیں۔ طالب علموں کو صرف خشک کتابی تعلیم دینا کافی نہیں ہے۔ ان کے لئے ایسے مواقع فراہم کرنے چاہئیں کہ ان میں سائنسی نظر پیدا ہوسکے۔ یہ اسی وقت ممکن ہوسکتا ہے جب اس بات کا مشاہدہ کرنے اور یہ جاننے میں دلچسپی پیدا ہو کہ قدرتی ماحول میں چیزیں کس طرح کام کرتی ہیں۔ اس مقصد کے لئے مناسب ذرائع اختیار کرنے چاہئیں۔"

جگدیش چندر بوس

جگدیش چندر بوس

انیسویں صدی کے آخری حصے میں ہمارے ملک میں ایک زبردست سائنس داں پیدا ہوئے۔ جگدیش چندر بوس۔ انہوں نے علم طبعیات (فزکس)، علم نباتات (باٹنی) اور علم عضویات (فزیالوجی) پر معمولی آلات کے ساتھ بہت دور رس تجربات کیے۔ انہوں نے پودوں، حیوانات اور دھاتوں میں جو بنیادی یکسانیت ہے اس کو ظاہر کیا۔ انہوں نے ہندوستان کو دنیا کے سائنس داں ملکوں میں جگہ دلائی۔ موجودہ زمانے میں ان کی انقلابی سائنسی تحقیقات نے اتنا اثر ڈالا تھا کہ لندن کا ٹائمز اخبار تک چپ نہ رہ سکا۔ یہ اخبار عام طور پر معمولی چیزوں کو اہمیت نہیں دیتا۔ اس اخبار نے لکھا تھا۔ "اب بھی ہم انگلستان میں وحشیانہ زندگی کے تجربات میں ہاتھ پیر مار رہے ہیں۔ ایک ہوشیار مشرقی نے اس کائنات کو فتح کرکے ایک رشتے میں پرو دیا ہے۔ اس نے ان بدلتے ہوئے حالات کی روشنی میں دنیا کو دیکھا ہے۔"

بچپن

جگدیش چندر بوس 30 نومبر 1958 کو پیدا ہوئے تھے۔ ان کے والدین باما سندری بوس اور بھگوان چندر بوس تھے۔ ان کی پیدائش میمن سنگ میں ہوئی تھی۔ جہاں ان کے والد نائب منصف کی حیثیت سے کام کرتے تھے۔ ان کے والد نظم وضبط کے پابند اور انصاف پسند تھے۔ ان کا دردمندوں انہیں سب کے بارے میں سوچنے پر مجبور کرتا تھا یہاں

تک کہ ان لوگوں کو جنھیں مجرم کہا جاتا تھا اور اپنے ماتحتوں کے لئے بھی وہ فکر مند رہتے تھے۔ جگدیش بچپن ہی سے اپنے والد کی شرافت سے بہت متاثر تھے۔

حکومت کے ملازم اپنے بچوں کو بہت مشہور اسکولوں میں داخل کراتے تھے، جن میں ذریعہ تعلیم انگلش تھا۔ لیکن بھگوان چندر بوس نے اپنے بچے کو ایک مقامی اسکول میں داخل کرایا۔ اس سے پہلے کہ بچہ کوئی غیر ملکی زبان سیکھے وہ اپنی مادری زبان سیکھنی ضروری سمجھتے تھے۔ انہوں نے یہ بات اچھی طرح سمجھ لی تھی کہ جو شخص اپنی تہذیب اور وراثت کو نہ سمجھے گا وہ کسی غیر ملکی تہذیب اور اس کی خصوصیات کو ہرگز نہ سمجھ پائے گا۔

جگدیش کے ساتھ کھاتے پیتے گھروں کے نازک سے لڑکے نہیں تھے۔ وہ مزدوروں، کسانوں، مچھیروں اور مسلمان لڑکوں کے ساتھ کھیلتے تھے۔ فطرت کی گود میں پلنے والے یہ بچے انہیں گہرے سمندر، چڑیوں، پودوں اور جانوروں کے قصے سناتے تھے۔ جگدیش ان قصوں کو بہت پسند کرتے تھے۔ اس سے ان کے دل میں فطرت کی چھپی ہوئی باتوں کے بارے میں کھوجنے اور سمجھنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ انہوں نے ان سے آدمی اور آدمی کے درمیان صحیح رشتوں اور فطرت سے اس کے بہت قریبی تعلق کو سیکھا۔

جگدیش چندر بوس نے ویویکانند کے اس بیان کو صحیح ثابت کردکھایا کہ "تعلیم وہ سائنس ہے جو بچے کے فطری اور سماجی ماحول کے تعلق اور اثر سے اس کی اندرونی صلاحیتوں کو روبہ کار لاتی ہے۔" انہوں نے معمولی نلکیوں اور آسانی سے مہیا ہونے والے سامان سے باغیچے کو پانی دینے کی ترکیب کی۔ اس سے ان کی کم عمری میں، سیدھے سادے اوزار بنانے کی صلاحیت ظاہر ہوئی اور انہی چیزوں سے انہیں آئندہ کی تحقیق میں بہت مدد ملی۔

جگدیش اکثر اسکول سے واپسی پر اپنے دوستوں کو بھی ساتھ لے آتے تھے۔ ان میں سے اکثر وہ بچے بھی ہوتے تھے جنھیں نیچی ذات کا کہا جاتا تھا۔ ان کی والدہ ان کے دوستوں سے بہت شفقت کے ساتھ پیش آتی تھیں۔ اس سے ان کی کھلے ذہن کا پتہ چلتا ہے۔

ان کے والدین کی اسی دانش مندی کے نتیجے میں جگدیش کو اپنی آئندہ زندگی میں بنیادی

قدروں کو کھوئے بغیر نئے حالات کے مطابق خود کو ڈھالنے میں کوئی دقت نہیں ہوئی۔ اپنی ابتدائی زندگی میں ان کے دل میں غریب لوگوں کے لئے بہت ہمدردی پیدا ہوگئی تھی۔ یہ ہمدردی صرف اوپری نہ تھی بلکہ ہر شخص کو سنجیدگی کی نگاہ سے دیکھ پرکھ کر اس کی ذاتی خوبیوں اور صلاحیتوں کی بنیاد پر ہوئی تھی۔ اور اس میں نسل، ذات یا برادری کو کوئی دخل نہ ہوتا تھا۔

ان کی ہمدردیاں اور محبت ہندوستان کی مشہور رزمیہ نظموں کے ہیرو کے ساتھ بھی تھیں۔ مہابھارت میں وہ کرن کی مصیبتوں سے بہت متاثر ہوئے تھے۔ حالانکہ کرن کا کردار دیوتاؤں جیسا تھا، پھر بھی بد قسمتی سے حالات نے ان کی زندگی کو نامکمل چھوڑ دیا تھا۔ جگدیش چندر بوس نے اپنے شاعر دوست رابندر ناتھ ٹیگور سے درخواست کی کہ وہ ایک نظم کے ذریعے کرن کو لافانی بنادیں۔ ٹیگور نے "کرن کنتی سمواد" کے نام سے ایک نظم لکھی بھی۔ اس میں کرن کے بارے میں جگدیش چندر بوس کی رائے جھلکتی ہے۔

تعلیم

نو برس کی عمر میں جگدیش چندر بوس نے ہرے (Hare) اسکول، کلکتہ میں اور بعد میں سینٹ زیویر اسکول میں داخلہ لیا۔ سینٹ زیویر خصوصی طور پر یوروپی یا اینگلو انڈین لڑکوں کے لیے تھا۔ انہیں وہاں اپنے ساتھیوں کی تنگ نظری اور سخت باتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ جگدیش کو اپنے اوپر زبردست اعتماد تھا۔ انہوں نے زندگی کو ایک چنوتی کے طور پر قبول کرلیا۔ جہاں رکاوٹیں آتی ہیں لیکن ان پر ایک یقین اور اعتماد کے ذریعے قابو پایا جاسکتا ہے۔ ان خوبیوں کے ساتھ فطرت سے مستقل محبت نے انہیں ایک زبردست ذہانت کا مالک بنادیا تھا۔

مستقبل کا ایک فطرت پرست اور سائنس داں ان کے اسکول کے زمانے کی دلچسپیوں اور مشغلوں میں بھی صاف نظر آتا ہے۔ ان کا تمام فاضل وقت اور رقم دونوں پالتو جانوروں اور چھوٹے سے باغیچے کے رکھ رکھاؤ پر خرچ ہوتے تھے۔

1880 میں جگدیش چندر بوس ڈاکٹری (میڈیسین) کی تعلیم کے لئے انگلستان گئے۔ لیکن قسمت نے ان کے لئے دوسرا ہی پروگرام بنا رکھا تھا۔ تعلیم کے پہلے ہی سال میں وہ کالاآزار میں بیمار پڑگئے اور صحت کی خرابی کی وجہ سے تعلیم ترک کرنی پڑی۔ اب انہوں نے کیمبرج کے کرائسٹ کالج میں نیچرل سائنس میں داخلہ لیا۔

ان کے دو استادوں نے انہیں بہت متاثر کیا۔ اور ان کی ذہانت کو تجرباتی اور تحقیقاتی سائنس کے راستے پر لگادیا۔ ان میں سے ایک تھے علم طبیعات (فزکس) کے لارڈ ریلے اور دوسرے پروفیسر سڈنی وینس، ماہر علم نباتات (باٹنی) ان دونوں نے جگدیش کے شوق اور لگن کو بڑھانے میں بہت دلچسپی لی۔

پروفیسری

جے۔ سی۔ بوس 1885 میں ہندوستان واپس آئے۔ پریسی ڈنسی کالج کلکتہ میں علم طبیعات (فزکس) کے قائم مقام پروفیسر کی حیثیت سے ان کا تقرر ہوا۔ اسی زمانے میں اس اصول پر ایک قاعدہ بنایا گیا کہ یوروپی صرف اپنے یوروپی ہونے کی وجہ سے کسی بھی کام کے لیے بالکل ٹھیک مانا جاتا تھا، لیکن ایک ہندوستانی صرف ہندوستانی کی حیثیت سے یوروپی کے برابر مستعد نہیں تھا۔ اس لیے یوروپی اور ہندوستانی برابر تنخواہ کے مستحق نہ تھے۔ ہندوستانی، یوروپی کے مقابلے میں صرف دو تہائی تنخواہ کا مستحق تھا۔ بوس کو دو تہائی کی بھی آدھی تنخواہ ملتی تھی۔ کیونکہ وہ صرف قائم مقام پروفیسر تھے۔ بوس، جو اپنی قومیت پر فخر کرتے تھے، ان کی خودداری نے یہ توہین برداشت نہ کی۔ انہوں نے تنخواہ قبول نہ کی۔ اور تین سال تک اپنے فیصلے پر قائم رہے۔ حالانکہ وہ اور ان کا خاندان اس عرصے میں سخت مالی پریشانی میں مبتلا رہے۔

ذہنی آزادی کا یہ مضبوط جذبہ ان کے کردار کی بنیاد تھا۔ کئی سال بعد 1913 میں انہوں نے اس مسئلے پر پبلک سروس کمیشن کے سامنے ہندوستانیوں کے ساتھ اس فرق کے برتاؤ کے خلاف پرزور احتجاج کیا۔ اس وقت تک وہ عالمی شہرت والی شخصیت بن چکے

تھے۔ نام اور شہرت کی وجہ سے انہیں خود کو اپنے ہم وطنوں میں شامل کرنے میں کوئی دشواری نہ ہوئی۔

1887 کے شروع میں انہوں نے ابالا داس سے شادی کی۔ وہ ایک مشہور وکیل درگا موہن داس کی بیٹی تھیں۔ یہ دیش بندھو چترنجن داس کے چچا کے لڑکے تھے۔ ابالا داس اس وقت مدراس میڈیکل کالج میں تعلیم حاصل کررہی تھیں۔ انہوں نے پڑھائی چھوڑدی تاکہ شوہر کے ساتھ مستقل طور پر رہ سکیں۔ انہوں نے مشکلوں کے پورے زمانے میں بوس کا ساتھ دیا۔ ان کی پرسکون فطرت نے بوس کی پرجوش اور جذباتی طبیعت کو متوازن رکھا۔ ان کے اکلوتے دودھ پیتے بچے کی موت نے ان دونوں کو ایک دوسرے کے بہت قریب کردیا۔ ابالا بوس ایک نرم دل میزبان اور سرگرم سماجی کارکن تھیں۔ انہوں نے "ناری شکشا سمیتی" بنائی۔ یہ ایک ایسا ادارہ تھا جو بنگال میں لڑکیوں اور عورتوں میں تعلیم پھیلانے کے لئے وقف تھا۔

طبیعات (فزکس) میں تحقیق

پریسی ڈینسی کالج میں جے۔ سی۔ بوس پر تدریسی کاموں کا بہت بوجھ تھا تاہم تحقیقی کاموں سے انہیں جو لگاؤ تھا وہ اسے دیر رات تک کام کرکے پورا کرتے رہتے۔ انہوں نے بیس مربع فٹ کا ایک کمرہ بطور تجربہ گاہ استعمال کیا، خود اپنے اوزار اور آلے بنائے اور طبیعات میں اپنے کام کی ابتدا کردی۔

جے۔ سی۔ بوس نے 1885 میں وائرلیس لہروں کے وجود اور پھیلاؤ کی تشریح کی جس کی نشان دہی کئی دہے پہلے جیمس کلارک میکس ویل کرچکا تھا۔ الیکٹرو میگنیٹک لہروں پر انگلینڈ کے سائنس داں اولیور لوج اور جرمنی کے ہائین رچ ہرٹز خاصہ کام کرچکے تھے اور ان لہروں کو "ہرٹزیئن لہریں" کہا جانے لگا تھا۔

چونکہ روشنی کی لہروں سے ملتی جلتی بجلی کی لہروں کی خصوصیات کا مطالعہ زیادہ فائدہ مند نہیں تھا اس لیے جے۔ سی۔ بوس نے ریڈیو شارٹ ویوز پر اپنی توجہ مرکوز کی۔ برخلاف

ہرٹز اور لوج کے، جنھوں نے ان لہروں کو بالترتیب ڈیسی میٹر اور سینٹی میٹر میں پیش کیا تھا، بوس نے ان لہروں کی پیمائش کو ملی میٹر سطح تک پہنچا دیا۔

پٹسن جیسی معمولی شے کی ریشوں کے استعمال سے بوس ایسے طریقے نکالنے میں کامیاب ہوگئے جن سے برقی لہروں میں برقی میلان کا حاصل کرلینا ممکن تھا۔ یہ ریسیورز (آوازگیر) "کوہیررس" (Coherers) کہلاتے تھے۔ بوس نے ہرٹزئین لہروں کا بہت گہرائی سے مطالعہ کیا اور وہ ایک بے مثال "کوہیرر" بنانے کے قابل ہوگئے جسے اگر وہ چاہتے تو صنعتی فائدے کے لیے بھی استعمال کرسکتے تھے۔ دراصل 1885 کے دوران تو انہوں نے اپنی اس ایجاد کے ذریعے دنیا بھر میں، جہاں جہاز رانی ہوتی تھی، وہاں ساحلی برق کاری نظام میں انقلاب برپا کردیا ہوتا۔ ان کے بنائے ہوئے بے مثال ریسیورز جہازوں پر رکھ دیئے جاتے جو برق خانوں لائٹ ہاؤس سے روانہ کی گئی برقی لہروں کو حاصل کرسکتے تھے۔ بوس اپنی ایجادات سے محض علمی دلچسپی رکھتے تھے۔ انہوں نے علم سے مادی فائدہ حاصل کرنے میں کبھی دلچسپی نہیں لی۔ اسی زمانے میں ان کا ہم عصر مارکونی، جس نے دوسرے یورپی سائنس دانوں کے ساتھ کام کیا تھا، لمبی دوری کے ریڈیو سگنل وضع کرکے اسی میدان میں اپنے تحقیقی کارناموں کو مالی فائدہ حاصل کرنے کے لئے استعمال کرچکا تھا۔

1885 میں کلکتہ کے ٹاون ہال میں بوس نے جو مظاہرہ پیش کیا وہ وائرلیس ٹیکنالوجی کے میدان میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ خود اپنے بنائے ہوئے آلات کی مدد سے انہوں نے برقی لہروں کو دو کمروں کی دیواروں سے گزارا جنھوں نے تیسرے کمرے میں داخل ہوکر ایک توپ اور ایک پستول کو داغا اور گن پاوڈر کے ایک ڈھیر کو اڑا دیا۔

انہوں نے دوسرا بڑا زبردست کام جو 1886 میں انجام دیا وہ برقی لہروں کی "ڈفریکشن گریٹنگ" (Diffraction grating) کے ذریعے لمبائی معلوم کرنا تھا۔ یعنی کسی ایسی سطح سے روشنی کو منعکس ہونے دینا جس پر قریب قریب لائنیں ہوں جو اسے اسپیکٹرم (Spectrum) (طیف) میں تبدیل کردیں۔ یہ ایک ایسا میدان تھا جس میں بہت سے ماہرین طبیعات نے جن میں ہرٹز بھی شامل تھا متضاد یا ایک دوسرے کے خلاف نتیجے

حاصل کیے تھے۔ بوس کو اس مسئلہ کا حل نکالنے میں کامیابی حاصل ہوئی۔

شارٹ ویو ریڈی ایشن (Short wave radiation) (شعاع افشانی) کے میدان میں حاصل کیے گئے شاندار کارناموں کے سبب بوس کے گہرے مطالعے کی سمت جو انہوں نے برقی لہروں میں برقی میلان سے متعلق حاصل کی تھی، اور ان کی تحقیقاتی مہارت، جو انھیں اپنے نظریات کو دکھانے کے لئے آلات بنانے میں حاصل تھی، ان سب چیزوں نے سائنسی دنیا کی توجہ اپنی جانب مبذول کرائی اور انہیں لندن یونیورسٹی کی تعریف و تحسین حاصل ہوئی۔ انہوں نے اپنا کام ایک تھیسس کی شکل میں رایل سوسائٹی کو اشاعت کی غرض سے پیش کیا۔ یہ مقالہ اتنا معیاری تھا کہ لندن یونیورسٹی نے انہیں ڈاکٹر آف سائنس کی ڈگری عطا کی اور اس کے لیے طالب علم کا آمنے سامنے امتحان، جو ایک لازمی ضرورت تھی، اسے بھی ختم کر دیا۔

1896 میں بوس یورپ کے صف اول کے سائنس دانوں سے ملنے اور ان کی تجربہ گاہوں کے متعلق معلومات اور جانکاری حاصل کرنے کے لیے انگلینڈ گیے۔ جب وہ یورپ میں تھے تو انہوں نے اپنی تحقیقات پر کئی تقریریں کیں۔ ان تقریروں نے مغربی دنیا کو قائل کر دیا کہ ہندوستان نے محض غیر معمولی فلسفی ہی نہیں بلکہ بلند پایہ سائنس دانوں کو بھی جنم دیا ہے۔ فرانسیسی سائنس اکیڈمی کے صدر پروفیسر اے۔ کارنو نے بوس کی ستائش میں کہا۔ آپ کو اپنی اس نسل کی اعلیٰ قدروں کو پھر سے زندہ کرنا چاہیے جس کے ہاتھوں میں سائنس اور آرٹ کی مشعل تھی اور جو 2000 سال پہلے تہذیب کی قائد تھی۔ ہم فرانس میں آپ کو آفریں کہتے ہیں اور ہر محاذ پر آپ کی کامیابی کی دعا کرتے ہیں۔"

جاندار اور بے جان

جے۔ سی۔ بوس نے کوہیرنگ ریسیورز پر اپنی تحقیق جاری رکھی۔ انہوں نے معلوم کیا کہ اگر دھاتوں سے لگاتار برقی لہریں گزاری جائیں تو ان میں کمزوری آجاتی ہے یا دھات کی حساسیت (Sensitiveness) کم ہوجاتی ہے۔ انہوں نے یہ مفروضہ قائم کیا کہ یہ جانوروں

کے عضلات کمزور ہونے سے مشابہ ہے۔

جانداروں اور بے جان چیزوں میں مختلف قسم کے دباؤ اور تناؤ ہونے کی وجہ سے جو رد عمل ہوتا ہے ان میں آپسی مشابہت ثابت کرنے کی غرض سے انہوں نے ایک انوکھا آلہ مصنوعی ریٹینا (Artificial Retina) بنایا۔ ریٹینا یا پردہ چشم ہماری آنکھوں کا ایک حساس پردہ ہے جو روشنی کی لہروں سے متاثر ہوتا ہے۔ مصنوعی ریٹینا ایک غیر نامیاتی (in_organic) ماڈل ہے جو جاندار نسیجوں (tissues) پر ہونے والے برقی رد عمل کی خصوصیات کو دکھا سکتا ہے۔ یہ آلہ گیلینا (Galena) کا بنا ہوا تھا جو کہ سیسے کا ایک نوری موصل (Photoconductor) ہوتا ہے، جو برقی میگنیٹک لہروں کے لیے حساس ہوتا ہے۔ بوس نے گیلینا کونٹیکٹ (Galena Contact) کے سامنے ایک عام لینس رکھ دیا۔ ایک گیلوینومیٹر (galvanometer) کی مدد سے اس پر ہونے والی برقی رو کا اثر ناپا گیا اور پھر اس کا تعلق گیلینا سے قائم کردیا گیا۔ اس سے گیلینا کونٹیکٹ کا تعلق برقی میگنیٹک لہروں سے قائم کرکے گیلوینومیٹر کی سوئی کا جھکاؤ دیکھتے ہوئے ایک خط منحنی (Curve) تیار کیا گیا۔ ردعمل میں تبدیلی گیلینا میں پیدا ہونے والی کمزوری کے باعث تھی۔ بوس نے جو خط منحنی بنایا تھا وہ بالکل ویسا ہی تھا جو ڈاکٹر ویلر نامی فزیالوجسٹ (ماہر عضویات) نے اس وقت حاصل کیا تھا جب اس نے ایک مینڈک کے پردہ چشم پر یہی عمل دہرایا تھا۔

جے۔ سی۔ بوس نے جانداروں اور ٹن جیسی بے جان اشیاء پر مختلف کیمیائی عوامل کے اثرات دکھاکر اپنے حاصل کردہ نتیجوں کو مزید تقویت پہنچائی۔ جس طرح ایک جاندار نسیج (ٹیشو) میں جو زہر کے اثر سے مرچکا ہو حساسیت باقی نہیں رہتی اسی طرح ٹن میں بھی برقی رو کے لیے حس ختم ہونے لگتی ہے۔ ان حقائق نے بوس کو قائل کردیا کہ جانداروں اور بے جان دھاتوں کے درمیان حد فاصل بہت کمزور ہے۔ جہاں تک حیاتی مظاہر کا تعلق ہے، بے جان اشیاء اور جاندار مادوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔

جولائی 1900 میں جے۔ سی۔ بوس نے پیرس میں منعقد ہونے والی انٹرنیشنل

کانگریس آف فزکس کے دوران اپنے تجربات اور نتیجے سائنس دانوں کے سامنے پیش کیے۔ ایک لاسلکی (وائرلیس) کا بہت بڑا بیوپاری جس کا نام موئیرہیڈ تھا حاضرین میں شامل تھا۔ اس نے خواہش ظاہر کی کہ مصنوعی ریٹینا کو لاسلکی ٹیلی گرافی کے لیے تجارت کی خاطر پیٹینٹ کرالینا چاہیے۔ اگر بوس اس بات پر راضی ہوجاتے تو ان کی تمام معاشی مشکلات کا حل نکل آتا بہر طور، سائنس کے تجارتی استعمال کے خلاف ان کے سخت رویے نے اس درخواست کو منظور نہیں ہونے دیا۔

اتفاقاً اس کانگریس میں سوامی وویکانند بھی موجود تھے۔ وہ بوس کے سب سے بڑے مداح بن گئے اور انہیں ہندوستان کا مایہ ناز سپوت بتاتے ہوئے ان کی تعریف کی۔

10 مئی 1901 کو جے۔ سی۔ بوس نے رائل سوسائٹی میں اپنی تقریر کے دوران کہا۔ "آج شام میں نے آپ کو دباؤ اور تناؤ کی تاریخ میں زندہ اور بے جان کا خود ان کا اپنا تیار کیا رکارڈ دکھا دیا ہے جو درحقیقت اس قدر مشابہ ہے کہ ایک دوسرے سے فرق کرنا مشکل ہے۔" انہوں نے اپنی تقریر ان الفاظ پر ختم کی۔ پہلی بار میں اس پیغام کا ایک مختصر حصہ اس وقت سمجھ پایا تھا، جس کا اعلان میرے پرکھوں نے گنگا کے کنارے 30 صدی پہلے کیا تھا۔ وہ جو اس کائنات کی تبدیل ہوتی ہوئی نیرنگیوں میں صرف ایک ہی کو دیکھتے ہیں، حق ان ہی کے پاس ہے۔ کسی دوسرے کے پاس نہیں، کسی دوسرے کے پاس نہیں۔"

جب تقریر ختم ہوگئی اور تالیوں کی گڑگڑاہٹ کم ہوئی تو سررابرٹ آسٹن جو ایک مشہور فزسسٹ (physicist) اور دھاتوں کے ماہر تھے بولے۔ "میں نے ساری زندگی دھاتوں کی خصوصیات کا مطالعہ کیا ہے۔ میں یہ سوچ کر خوش ہوں کہ ان میں زندگی ہوتی ہے۔"

پھر بھی کچھ سائنس داں ایسے بھی تھے جنہوں نے بوس کے پرزور انداز فکر کو سمجھنے سے انکار کردیا جس کے ذریعہ بعض فزیو کیمیکل وجوہ کی بنیاد پر نامیاتی اور غیرنامیاتی اشیاء کو ایک کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ انہوں نے اسے میٹافزیکل (مافوق طبیعات) جیسی مشرقی دماغ کی کوئی خیالی تصویر تصور کیا۔

درحقیقت جب جے۔ سی۔ بوس نے کانگریس کے سیکریٹری کو اپنے اس خیال سے آگاہ کیا کہ فزکس، فزیولاجی اور سائیکولوجی ایک ہی ہیں تو اس نے متنبہ کیا۔ "ایک ہی ریلے میں سب کچھ سمجھانے کی کوشش نہ کرو کیونکہ لوگ اتنی زیادہ حیران کن باتیں ہضم نہیں کرپائیں گے۔ یہ انسانی فطرت ہے۔ اگر تم ان کا تعارف کراؤ گے تو وہ تمہیں خوابوں کی دنیا کا آدمی سمجھیں گے۔ اس لئے بہتر ہے کہ تم صرف فزیکل پہلو ہی سمجھانے سے ابتدا کرو۔"

البتہ یورپ کے سائنس دانوں کو جے۔ سی۔ بوس کے جینئس یا غیر معمولی دماغ کا مالک ہونے میں کوئی شبہ نہ تھا۔ انہیں ایک معروف یونیورسٹی نے پروفیسر کے عہدے کی پیش کش کی لیکن مادر وطن کی محبت اور اس کے لیے احساس ذمہ داری نے انہیں جگمگاتے یورپ کی طرف مائل نہ ہونے دیا اور وہ اپنی تحقیق اور مطالعہ جاری رکھنے کی خاطر ہندوستان واپس آگئے۔

حیران کن نظریات

بوس نے غیر نامیاتی اشیاء اور جانوروں کے نسیجوں ٹشیو کے برقی رد عمل میں مماثلت دریافت کی۔ انہوں نے پودوں میں اس رد عمل کی کھوج کی۔ اس طرح وہ فزکس اور حیوانیات سے پلانٹ فزیولاجی کی سرحد میں داخل ہوگئے۔ انہوں نے پودوں میں ایک ہی جیسا رد عمل پایا۔ انہوں نے کئی طرح کے بیرونی لمس کا استعمال کیا جن میں دونوں طرح کے لمس یعنی میکانکی جیسے رگڑ، دباؤ اور کیمیائی جیسے کوپر سلفیٹ (نیلا تھوتا) شامل تھے۔ ان کی مدد سے وہ دکھا سکے کہ پودوں کے نسیجوں پر لمسی رد عمل بالکل اسی طرح ہوتا ہے جیسا کہ جانوروں کے نسیجوں پر۔ تاہم بعد کی دریافتوں میں ان کا یہ مفروضہ کہ پودوں میں فلوئیم نسیج (phloem tissues) جانوروں کے اعصاب (nerves) جیسے ہوتے ہیں، باطل قرار دیا گیا۔

فزیالوجی کے بعض ماہر، جیسے ڈاکٹر والر اور برڈون سینڈرسن نے ان کے ان خیالات سے اختلاف کیا کہ فطرت کے تنوع (پھیر بدل) میں وحدانیت ہوتی ہے۔ ان کے سخت انداز

فکر نے ایک فزیولاجسٹ کی مداخلت کو ان کی سلطنت میں جارحیت کے مصداق سمجھا۔ انھیں ڈر تھا کہ ان کی نئی دریافتیں فزیولاجسٹ کے پرانے اور پائیدار عقیدوں کو درہم برہم کر دیں گی۔ یہاں تک کہ انھوں نے رائل سوسائٹی کو قائل کرنے کی کوشش کی کہ ان کے مقالے نہ چھاپے جائیں۔

جے۔ سی۔ بوس نے وقار اور سکون کے ساتھ اس مخالفت کو قبول کیا۔ انھوں نے ضرورت سے زیادہ محدود موضوع پر گہرے مطالعے specialisation سے پیدا ہونے والے خطرات کی پیش بینی کی تھی اور نتیجہ اخذ کیا تھا۔ "اس بنیادی حقیقت کے گم ہوجانے کا خطرہ تھا کہ سچائی اور سائنس ایک ہوتی ہے جس میں علم کی تمام شاخیں شامل ہیں۔"

وقت نے ثابت کر دیا کہ وہ بڑی حد تک درست تھے۔ فزکس، فزیولاجی اور سائیکالوجی کے لیے ان کا جو نظریاتی انداز فکر تھا اس نے سائنس دانوں کو فطرت کے بارے میں ایک متفقہ تصور قائم کرنے پر آمادہ کیا جس نے بالآخر ایک جدید سائنس "سائی برنے ٹکس" کو جنم دیا۔

جے۔ سی۔ بوس نے ایک بہت نازک آلہ بنایا جسے کریسکو گراف، (crescograph) کہتے ہیں۔ یہ ایک برقی آلہ ہے جس کی مدد سے ایک پودے کی بڑھوتری کو ایک ہزار سے دس ہزار گنا تک بڑھاکر صحیح صحیح ناپا جاسکتا ہے۔ کریسکو گراف کی مدد سے ان کیفیات کا مطالعہ ممکن ہے جو پودے کی نشوونما کی شرح کو تبدیل کر دیتی ہیں۔ یہ ایک ایسا عنصر ہے جو زراعتی سائنس دانوں کے لیے مفید ہے۔ بوس نے ہرے پودوں میں فوٹو سنتھیسس کی صحیح صحیح شرح بھی معلوم کی اور اس امکان کی طرف اشارہ کیا کہ سورج کی توانائی، جو فوٹو سنتھیسس کے دوران پودے جذب کرتے ہیں، اس کا زیادہ بہتر استعمال ہوسکتا ہے۔

ایک نظریہ جو جے۔ سی۔ بوس نے پیش کیا وہ خلیوں کے فزیولاجیکل عمل یعنی رقیق مادوں (سیپ sap) کے اوپر کی طرف چڑھنے کے بارے میں تھا۔ سیپ کے اوپر چڑھنے کا مطلب ہے پودوں کی جڑوں کے ذریعے پانی کا جذب کرنا اور پھر مخصوص نالیوں کے ذریعے

پودے کے تمام حصوں تک اسے منتقل کرنا۔ بوس کے مطابق سیپ کے اوپر چڑھنے کا عمل اس دباؤ یا پمپنگ سے متاثر ہوتا ہے جو دباؤ مخصوص نالیوں پر وہ خلیئے ڈالتے ہیں جو ان کے نزدیک موجود ہوں یہ "وائیٹل" (Vital) نظریہ بھی کہلاتا ہے۔ آج تک اس نظریہ کی تائید میں براہ راست کوئی ثبوت نہیں ہے۔

جے۔ سی۔ بوس نے پودوں اور جانداروں کی اندرونی کارکردگی کو سمجھنے کے لئے کئی خود کار رکارڈرس ایجاد کیے جو انتہائی نازک اور صحیح صحیح ریڈنگ دینے والے تھے۔ ادب کے نوبل انعام یافتہ ہنری برگ ساں نے ایک بار کہا۔ "بوس کی معرکۃ الآرا ایجادات نے گونگے پودوں کو ان کی پوشیدہ زندگی کے اظہار کے لئے انتہائی مستند گواہ بنادیا۔ بالآخر فطرت کو اس بات کے لئے مجبور کردیا گیا کہ وہ اپنے ان رازوں کو اگل دے جو حفاظت کے ساتھ پوشیدہ رکھے گئے تھے۔"

جے۔ سی۔ بوس کے بعض نظریات ترقی یافتہ طریقوں سے کی گئی تحقیقات کی کسوٹی پر پورے نہ اتر سکے تاہم ان کی بہت سی دریافتوں نے فطرت کے بارے میں غلط تصورات کو مٹا دیا اور مستقبل میں تحقیق کی بنیاد رکھی۔ بوس نے اپنے مطالعے کے لیے کئی پودوں کا استعمال کیا تھا جس میں مائی موسا۔ یا چھوئی موئی (Touch me not) کا پودا بھی شامل تھا۔ رابندر ناتھ ٹیگور نے بوس کے کام کی تعریف میں مائی موسا پر ایک نظم لکھی اور اسے ان کے نام سے منسوب کردیا۔

میری دوست، میری بھائی "مائی موسا" کو دیکھو
دیکھو آسمانوں نے اسے کیا دیا ہے
اور ہواؤں نے کیا اڑایا
اس کا دل کیا عجیب پیغام چھپائے ہوئے ہے۔
اس کے پتوں کی تہوں میں سے
تمہیں نکالنا ہوگا اور جاننا ہوگا
اور اس خاموشی کو توڑنا ہوگا

تم جانتے ہو میرے دوست کہ چھوٹا پن معمولی نہیں۔
چونکہ سچائی کا ایک ذرہ بھی دنیا کو جگمگا دیتا ہے۔
حیا سے میری مائی موسا کی آنکھیں بند ہیں۔
میں جانتا ہوں تم پڑھو گے
زندگی اور موت کے پیغامات،
سورج کے اور سایے کے اور طوفان کے۔

شدید قومی جذبے نے جے۔ سی۔ بوس کو عام روایت کے مطابق اپنے آلات کے نام یونانی اور لاطینی کے بجائے سنسکرت میں رکھنے پر اکسایا۔ لیکن انھیں اپنا خیال بدلنا پڑا کیونکہ انگریزی زبان میں ان الفاظ کا تلفظ کچھ سے کچھ ہوگیا۔

جے۔ سی۔ بوس کی زبردست خواہش تھی کہ ان کے ہم وطن توہمات سے چھٹکارا حاصل کرنے کی غرض سے سائنسی مزاج اور ایک تجزیاتی دماغ پیدا کریں کیونکہ بہت سوں کی ترقی کے لیے یہ ایک رکاوٹ تھی۔ مثال کے طور پر فرید پور میں ایک پام کا درخت تھا جو آندھی کے دوران زخمی ہوگیا تھا۔ مقامی لوگ اسے "عبادت گزار پام" کہتے تھے کیونکہ وہ شام کو جھک جاتا تھا۔ لوگوں کا اعتقاد تھا کہ یہ ایک عبادت کرنے والا درخت ہے جو شام کو مندر کی گھنٹی بجنے پر عبادت کے لئے اپنا سر جھکا لیتا ہے اور صبح کو پھر سیدھا ہو جاتا ہے۔ بوس نے لوگوں کو دکھایا کہ پیڑ کا یہ عمل درجہ حرارت میں تبدیلی کی بناء پر تھا۔ پیڑ کی اوپری اور نچلی سطح پر درجہ حرارت سے پیدا ہونے والی تبدیلی یکساں نہیں تھی۔ اس لیے درجہ حرارت کی تبدیلی نے صبح کے مقابلے شام میں جھکاؤ کو زیادہ کر دیا۔ پیڑ کی حرکت اس کی دونوں سطحوں پر غیر یکساں ردعمل کی بناء پر تھی۔

اسکولوں میں سائنس کیسے پڑھائی جانا چاہیئے اس کے بارے میں جے۔ سی بوس کے خیالات بہت جدید اور عملی تھے۔ انھوں نے کہا تھا۔ "ایجادی اور تخلیقی قوتیں محض سائنس کے مشکل اور پیچیدہ نظریات پر کام کرنے سے حاصل نہیں ہوتیں بلکہ فطرت سے ہم آہنگی اور مشاہدے کی شدید قوت ہی سائنس کی اہم ترین محرک ہے۔ لوگ جو اپنی ذہانت کے لیے

جانے جاتے ہیں ضروری نہیں کہ وہ اسکول میں سخت امتحان سے بھی پار اتر گئے ہوں۔"

1828 کے دوران جب بمبئی میں جے۔ سی۔ بوس نے یوتھ لیگ کو مخاطب کیا تو زور دے کر کہا کہ جب انہیں کوئی کام سپرد کیا جائے تو انہیں یہ کہہ کر کہ میں کوشش کروں گا، اس سے فرار کے بہانے تلاش نہیں کرنا چاہئیں۔ انہوں نے نوجوانوں سے کہا کہ اپنی ناکامی کے لئے انہیں یونیورسیٹوں، گورنمنٹ اور ناموافق حالات کو الزام نہیں دینا چاہیئے۔ اس کے برعکس انہیں درپیش حالات کو قبول کرنا چاہیئے اور مقصد کو سامنے رکھتے ہوئے اس کی تکمیل کے لیے کام کرنا چاہئے۔ اس کے لیے شاید خود بوس سے زیادہ اچھی مثال نہیں ہے۔

جے۔ سی۔ بوس انگریزی اور بنگالی کی کئی کتابوں اور مقالوں کے مصنف ہیں جن میں سے چند کے نام ہیں۔ زندہ اور بے جان میں رد عمل (Response in living & Non_living)، پودوں کے حسی نظام (The Nervous Mechanism in Plants) اور پودوں میں نشوونما اور ٹراپک حرکت اور تقابلی الیکٹرو فزیولاجی (Growth and Tropic movement in Plants and Comparative Electro_physiology) ۔ ان کی بہت سی کتابوں کا یورپین زبانوں میں ترجمہ بھی ہوا۔ انہوں نے مختلف موضوعات پر کئی سائنسی مقالے بھی شائع کیے اور مزاح کی چاشنی کے ساتھ آسان اور غیر تکنیکی زبان استعمال کی۔

جے۔ سی۔ بوس نے کافی پہلے 1894 میں بچوں کے لیے پودوں کی زندگی کے بارے میں عام فہم زبان میں مضامین لکھے تاکہ انہیں پودوں سے دلچسپی پیدا ہو۔ وہ ان میں پودوں کی زندگی سے متعلق سائنسی سوجھ بوجھ پیدا کرنے کی امید رکھتے تھے۔

کائناتی وحدت

شاعر رابندر ناتھ ٹیگور جنھوں نے اپنی شاعری کے ذریعے قوم میں بیداری پیدا کی اور بڑھاوا دیا، بہن نوے دتا جو روحانیت اور قومیت کا نشان تھیں اور جے۔ سی۔ بوس خود،

جنھوں نے ہندوستانی قومیت کو سائنس کے میدان میں شاندار طریقے سے پھلنے پھولنے میں مدد کی تھی، دوستی کے مضبوط بندھن میں بندھ گئے۔ یہ تینوں کائناتی وحدت کے متلاشی تھے جس کا اظہار ٹیگور کے شاعرانہ تخیل، بوس کے تنوع میں وحدت کے تصور اور نوے دتا کی روحانیت کی کھوج میں نظر آتا ہے۔

شاعر ٹیگور اور جے۔ سی۔ بوس نے ضرورت کے وقت ہمیشہ ایک دوسرے کا ساتھ دیا اور دنیا کو بہتر سے بہتر دینے کے لیے ایک دوسرے سے ترغیب اور فیضان حاصل کیا۔ جب بوس کو بیرون ملک اپنے قیام کے دوران سخت معاشی دشواریاں پیش آئیں تو ٹیگور نے رقم کا انتظام کیا تاکہ وہ اپنی تحقیق مکمل کرلیں۔ نوے دتا کی خواہش تھی کہ بوس ایک ادارہ قائم کریں جو ہندوستان کی عقل و دانش کو جلا بخشے تاہم اس سے پہلے کہ ان کا خواب شرمندہ تعبیر ہوتا، ان کا انتقال ہوگیا۔

بوس کا تحقیقی ادارہ

بوس ایک حقیقی اور خالص علمی ذہن کے مالک تھے اس لئے ملک کے لیے وہ اپنی ذمہ داری سے غافل نہ رہ سکے۔ وہ اس بات سے باخبر تھے کہ ہندوستانی طلباء کے پاس ذہانت دلچسپی اور سائنسی تحقیق کے لیے ذہنی فکر موجود ہے لیکن وہ وسائل اور سہولتوں سے محروم ہیں۔

30 نومبر 1917 کو بوس کا سب سے زیادہ پسندیدہ خواب شرمندہ تعبیر ہوا جب "بوس ریسرچ انسٹی ٹیوٹ" عالم وجود میں آیا۔ افتتاحی گیت کسی اور نے نہیں بلکہ ٹیگور نے لکھا اور لیکچر ہال کو مشہور مصور نندن لال کی پینٹنگ نے زینت بخشی۔ یہ جستجو اور دانشمندی کا نشان تھا جس میں تخیل کی پرواز شامل تھی۔

بوس نے انسٹی ٹیوٹ کی کگر کو سجانے کے لئے سوجھ بوجھ کے ساتھ بجلی کا کڑکا (وجرا) اور آدھی املکی (گوزبیری پھل) کا انتخاب کیا۔ یہ نشانات انتہائی قربانی اور خدمت کو پیش کرتے ہیں۔ خیال کیا جاتا ہے کہ سنت وادھی چی نے اپنی جان قربان کردی تاکہ ان کی ہڈیاں

بجلی کا کڑکا (وجرا) بن کر برائی کے خاتمے کے لیے استعمال ہو سکیں۔ اسی طرح یہ بھی خیال کیا جاتا ہے کہ بادشاہ اشوک کا نے اپنی تمام دنیاوی چیزیں تیاگ دیں جن میں آخری املاک کا آدھا پھل بھی تھا۔

اپنے روح پرور افتتاحی خطبے میں جے۔ سی۔ بوس نے انسٹی ٹیوٹ کو مندر سے تعبیر کیا جہاں اسکالرس حق کی تلاش میں انتھک کوشش کریں گے۔ بوس نے زور دیا کہ ہندوستان کو اپنے وجود کی حفاظت کے لئے ایک ایسی قوم بن جانا چاہیئے جو صنعتی اور تجارتی اعتبار سے ترقی یافتہ ہو اور جہاں مغرب کی مانند تخریب کے لیے سائنس کا غلط استعمال نہ کیا جائے۔ انہوں نے کہا۔ "تمام دریافتیں عوام کی ملکیت ہوں گی۔ کوئی شے پیٹنٹ نہیں ہوگی۔ میری یہ بھی خواہش ہے کہ اس انسٹی ٹیوٹ کی سہولتیں تمام ممالک کے کام کرنے والوں کو فراہم کی جائیں۔ اسی طرح میری کوشش ہوگی کہ میرے ملک کی وہ روایات قائم رہیں جنہوں نے 25 صدی پہلے اپنی قدیم درسگاہوں نالندا اور ٹکسلا میں دنیا کے مختلف حصوں سے آنے والے طالب علموں کو خوش آمدید کہا تھا۔"

اس بات پر زور دیتے ہوئے کہ علم حقیقتاً بین الاقوامی ہے، جے۔ سی۔ بوس نے امید ظاہر کی کہ ہندوستان کا ذہین ترین دماغ جو انسٹی ٹیوٹ کے دروازوں سے نکلے گا وہ پھولے پھلے گا اور انسانیت کے مفاد میں اپنی خوشبوئیں بکھیرے گا۔

جے۔ سی۔ بوس نے جو کہا اس پر عمل کیا۔ انہوں نے برطانوی دانشوروں کے ایک مجمعے کے سامنے میگنیٹک کریس کوگراف **(MagneticCrescograph)** کے بارے میں جو توضیح اور تشریح کی اس پر ٹائمس نے بیان دیا "سائنس کے لیے ان کی کوششیں محض سائنس کے لیے نہیں ہیں بلکہ انسانوں کے لیے اس کے استعمال اور فوائد کے پیش نظر ہیں۔"

انسٹی ٹیوٹ کو عوام اور گورنمنٹ سے خاطر خواہ امداد ملی۔ گاندھی جی کی عوام سے اپیل کا ردعمل بہت فیاضانہ تھا۔ انسٹی ٹیوٹ نے پابندی کے ساتھ "ٹرانزیکشن آف دی بوس ریسرچ انسٹی ٹیوٹ" نکالا جس نے انسٹی ٹیوٹ میں ہونے والی نئی تحقیقات سے دنیا

کو روشناس کیا۔

جے۔ سی۔ بوس پر قومی اور بین الاقوامی اعزازات کی بارش ہوئی۔ انہیں 1913 میں ملازمت سے سبکدوش ہونا تھا لیکن پریسی ڈینسی کالج نے انہیں خصوصی اعزاز دیتے ہوئے ان کی خدمات مزید دو سال کے لئے بڑھادیں اور وہ 1915 میں ریٹائر ہوئے۔ گورنمنٹ نے مزید پانچ برس کے لئے پوری تنخواہ پر انہیں بحیثیت "امیریٹس پروفیسر" نامزد کیا۔ 1917 میں جے۔ سی۔ بوس کو "نائٹ ہوڈ" (Knight hood) (سر) کے خطاب سے نوازا گیا۔

13 مئی 1920 کو جے۔ سی۔ بوس رائل سوسائٹی کے فیلوشپ منتخب ہوئے وہ پہلے ہندوستانی تھے جنہیں سائنس کے میدان میں یہ مرتبہ حاصل ہوا تھا۔ کلکتہ یونیورسٹی نے انہیں "کمپے نیئن آف اسٹار آف انڈیا" (Companion of Star of India) اور "کم پے نیئن آف دی انڈین ایمپائر" (Companion of the Indian Empire) کے خطابات دیئے۔ بہت سے ممالک اور شہروں جیسے جرمنی، مصر، ویانا، برلن نے انہیں اپنی یونیورسٹیوں میں لکچر دینے کے لئے مدعو کیا۔ مشہور و معروف سائنس دانوں نے ان کے اعزاز میں استقبالیہ دیئے۔ وہ چھ مہینے سے زیادہ سائینٹفک ڈپوٹیشن (Scientific deputation) پر یوروپ بھیجے گئے۔ 1926 میں بوس کو لیگ آف نیشنز کی "کمیٹی آن ان ٹیلکچوئل کوآپریشن" کا ممبر نامزد کیا گیا جس کی سالانہ میٹنگ جنیوا میں ہوتی تھی۔

جے۔ سی۔ بوس کے ساتھی ذہین ترین افراد جیسے نوبل انعام یافتہ البرٹ آئینسٹائن اور مشہور برٹش اسکالر جارج گلبرٹ تھے۔ بوس نے اپنی کامیابی کو کبھی ذاتی فتح نہیں کہا بلکہ اسے اپنے ملک ہندوستان کی کامیابی قرار دیا۔

جے۔ سی۔ بوس کو ان کی ستر سالہ یوم پیدائش پر معروف شخصیات جیسے رچرڈ گری گوری، جو نیچر میگزین کے ایڈیٹر تھے، جارج برنارڈ شاہ پروفیسر ہنس مولیش جانے مانے پلانٹ فزیولاجسٹ تھے اور روماں رولاں نے انہیں مبارکباد پیش کی۔ پروفیسر مولیش بوس کے کام کے بڑے مداح تھے۔ انہوں نے بوس کی کتاب پلانٹ آٹوگرافس اینڈ دیئر ریویلیشن

(Plant Autographs and their revelation) کے جرمن ترجمے کا پیش لفظ لکھا۔ وہ بوس انسٹی ٹیوٹ میں بحیثیت مہمان پروفیسر تشریف لائے۔

جے۔ سی۔ بوس کے سائنسی کام میں جو ایک فلسفیانہ انداز فکر شامل تھا اسے صرف سائنس دانوں ہی نے نہیں بلکہ تمام حساس دماغوں نے پسند کیا۔

پیکر

جے۔ سی۔ بوس ذیابیطیس اور ہائی بلڈ پریشر کے مریض تھے جس نے ان کی صحت کو متاثر کیا۔ 23 نومبر 1937 کو جب یہ عظیم سائنسداں تقریبا 79 برس کے تھے ان کا انتقال ہوگیا۔

جے۔ سی۔ بوس کے عظیم الشان کارناموں کا جائزہ لینے کے لئے یہ بات ذہن میں رہنا چاہیئے کہ انھوں نے کن حالات میں کام کیا تھا۔ ابتدا میں انھیں نہ تو کوئی مالی امداد حاصل تھی اور نہ ہی جدید ٹکنالوجی جو آج میسر ہے۔

بہن نویے دتا نے ایک خط میں ٹیگور کو لکھا۔ "میں یہ جان کر پریشان تھی کہ ایک بڑے کارکن کو لگاتار معمولی چیزوں کی دقتیں بھی ہوسکتی ہیں۔ کالج کے روز مرہ کاموں کو ہر ممکن حد تک ان کے لیے دشوار بنادیا گیا تھا تاکہ انھیں تحقیقی کاموں کے لئے وقت نہ مل سکے۔ پھر بھی یہ بات کتنی حیران کن ہے کہ ہمارے دوست نے اپنا کام جاری رکھا اور باوجود وقتی دشواریوں کے جو انھیں گھیرے تھیں، کارنامے نمایاں انجام دیئے۔"

جے۔ سی۔ بوس نے اس لازمی ہم آہنگی کو جو مشرقی دانشوری کی روح اور مغربی سائنس کے درمیان ہے اخذ کرکے دوسروں تک پہنچایا۔ وہ سائنس کو بلند کرکے روحانی حقیقت کے دائرے تک لے گئے۔ زندگی کا کائناتی تصور درحقیقت ان کا ایک باہمت خیال تھا۔

جواہر لال نہرو کی طرح جے۔ سی۔ بوس بھی خیال کرتے تھے کہ ہندوستانیوں کو سائنسی اور تجزیاتی دماغوں کو فروغ دینا چاہیئے جو سوسائیٹی کو بہتر بناسکیں، بھلائی اور ترقی کو یقینی بنائیں اور مجموعی طور پر دنیا پر اثر انداز ہوں۔ بوس کو زبردست سائنسی کارنامے انجام دینے کے سلسلے میں ہندوستانی صلاحیتوں پر اعتماد تھا۔ ان کی خواہش تھی کہ ہمیں سخت محنت

کرکے ہندوستان کو علم کا مرکز اور ایک اعلیٰ قوم بنالینا چاہیئے۔

ہمارا ملک صدیوں سے علم و دانش کا گہوارہ رہا ہے۔ جے۔ سی۔ بوس کے کام نے ہمیں ہماری وہ کوتاہیاں یاد دلائیں جو تلاش علم میں ہم سے ہوئی ہیں۔ ہم نے برسوں جہالت توہمات اور خوف کو پنپنے دیا جو ہمارے دل و دماغ پر غالب آگیا اور نتیجے میں ہمیں بد قسمتی اور افلاس ملا۔

جے۔ سی۔ بوس نے بوس انسٹی ٹیوٹ کی افتتاحی تقریر میں کہا تھا۔ "اس طرح طبعیات، فزیولاجی اور نفسیات کے راستے قریب آتے ہیں اور مل جاتے ہیں اور یہاں ہم ان لوگوں کو جمع کرتے ہیں جو نیرنگیوں میں یک رنگی دیکھیں گے۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں ہندوستان کا جینیئس (اعلیٰ طرز فکر یا تصور) صحیح معنوں میں پھل پھول سکے گا۔"

جگدیش چندر بوس نے ہندوستان کو مضبوطی کے ساتھ جدید سائنسی تحقیق اور کھوج کے راستے پر ڈال دیا۔

اسکولوں میں سائنس کیسے پڑھائی جانا چاہیئے اس کے بارے میں جے۔ سی بوس کے خیالات بہت جدید اور عملی تھے۔ انہوں نے کہا تھا۔ "ایجادی اور تخلیقی قوتیں محض سائنس کے مشکل اور پیچیدہ نظریات پر کام کرنے سے حاصل نہیں ہوتیں بلکہ فطرت سے ہم آہنگی اور مشاہدے کی شدید قوت ہی سائنس کی اہم ترین محرک ہے۔ لوگ جو اپنی ذہانت کے لیے جانے جاتے ہیں ضروری نہیں کہ وہ اسکول میں سخت امتحان سے بھی پار اتر گئے ہوں۔"

کستوربا گاندھی

سری دیوی راجن

انھیں کستور با کو قدرت نے ایک بڑی خوبی بخشی ہے۔ بہت بڑی خوبی، جو زیادہ تر ہندو عورتوں میں ملتی ہے۔ اور وہ ہے۔ خوشی سے یا مجبوری سے، شعوری طور پر یا بے سمجھے بوجھے، میرے کہنے پر چلنے کو انھوں نے ہمیشہ اپنی خوش قسمتی سمجھا۔ میرے کاموں میں کبھی رکاوٹ نہ بنیں اور کبھی مجھ سے احتیاط کے ساتھ کام کرنے کو نہ کہا۔ اس کے باوجود کہ ہم دونوں کی ذہنی سطح میں زبردست فرق تھا میں نے ہمیشہ یہ محسوس کیا کہ ہماری زندگی آسودگی، خوش حالی اور ترقی کی زندگی ہے۔

مہاتما گاندھی

کستوربا گاندھی

ہندوستان ایک ایسا ملک ہے جس میں بہت سے لوگوں کے نام یاد رکھنے کے قابل ہیں۔ بدقسمتی سے ہم ان میں سے بہت سوں کو بھول گئے۔ ہم ان میں سے کچھ سے واقف ہیں، جو براہ راست یا بالواسطہ آزادی کی جدوجہد میں شریک ہوئے۔ ان کے بارے میں مضامین یا کتابیں لکھی گئیں۔ ان کے علاوہ بہت سے لوگوں نے ملک کے لیے بڑی قابل قدر خدمات انجام دیں۔ ان ہی میں ایک کستوربا گاندھی بھی ہیں۔

کستوربا باپائے قوم مہاتما گاندھی کی بیوی کی حیثیت سے جانی جاتی ہیں۔ پھر بھی ان کی اپنی ایک شخصیت تھی۔ وہ قربانی اور بے غرضی کی نشانی تھیں۔ اگر نفس کشی اور قربانی کسی مہاتما کی خصوصیات ہیں تو کستوربا بھی مہاتما تھیں۔ ہندوستان کی خاتون رہنما سروجنی نائیڈو، اینی بیسنٹ اور وجے لکشمی پنڈت تعلیم یافتہ خواتین تھیں۔ لیکن کستوربا نہ تعلیم یافتہ تھیں اور نہ عام لوگوں سے کچھ اونچی یا الگ تھلگ۔ ایک روایتی ہندوستانی بیوی تھیں جو اپنے شوہر کے آرام اور خواہشات کو سب سے آگے رکھتی تھیں۔ سروجنی نائیڈو اور وجے لکشمی پنڈت نے ہندوستانی لوگوں کے دماغوں کو جیتا تھا، کستوربا نے ان کے دلوں پر قبضہ کیا تھا۔ جب ان کے شوہر ہندوستان کی آزادی کے لئے تکلیفیں برداشت کررہے تھے تو وہ بھی خاموش نہ بیٹھیں۔ کستوربا نے مختلف انداز میں گاندھی جی کی مدد کی انہوں نے ستیہ گرہ میں حصہ لیا، انگریزوں کے خلاف لڑنے کے لئے عورتوں کو منظم کیا، دیہاتی لوگوں کو اپنے حقوق کے لئے لڑنا سکھایا۔ انہوں نے اپنے شوہر کو خوش کرنے کے لئے اپنی دولت اور آرام

وآسائش سب چھوڑ دیئے۔ جبکہ عورتیں ان چیزوں کو پسند کرتی ہیں۔

پیدائش

کستوربا پوربندر میں اپریل 1869 میں پیدا ہوئی تھیں۔ اسی سال گاندھی جی بھی پیدا ہوئے تھے۔ ان کے والد گوکل داس ناکن جی ایک کامیاب تاجر تھے۔ گاندھی جی کے والد کرم چند کے قریبی دوست تھے۔ ان کی والدہ کا نام ویرج جنوربا تھا۔

بچپن میں کستوربا کو چھوت چھات کی تعلیم دی گئی تھی۔ ان کا خاندان کٹر مذہبی تھا۔ کماری کستوربا خاندانی روایات پر سختی سے عمل کرتی تھیں۔ صفائی ستھرائی تو عقیدے اور مذہب کا معاملہ تھا۔ اس لئے برتن، بھانڈے گھر اور باغ کا کونا کونا پوری طرح صاف رکھے جاتے تھے۔

پانچ اصول تھے جن کی انھیں تعلیم دی گئی تھی۔ یہ اصول تھے۔ کبھی جھوٹ نہ بولو۔ چوری نہ کرو۔ بری باتیں نہ کرو دنیا کی چیزوں کو زیادہ اہمیت نہ دو، پوجا کرنا نہ بھولو۔ کستوربا ان پر عمل کرتی تھیں اور زندگی بھر عمل کرتی رہیں۔ گھر میں کستوربا کے والد کی رائے کے سب پابند تھے۔ جب وہ کھانا کھالیتے تھے تب عورتیں، لڑکیاں اور چھوٹے بچے کھانا کھاتے تھے۔ یہ لوگ مکان کے زنانے حصے میں کھانا کھاتے تھے۔

شادی

کستوربا کی عمر سات سال تھی تو موہن داس سے ان کی منگنی ہوگئی۔ موہن داس، کرم چند کے چھوٹے بیٹے تھے۔ تیرہ سال کی عمر میں 1882 میں ان کی شادی ہوگئی۔ اب وہ کستوربا ناکوجی سے کستوربا گاندھی ہوگئیں۔

یہ وہ زمانہ تھا جب بچپن کی شادی غیر قانونی نہ تھی۔ اس زمانے میں لڑکیوں کو اسکول بھیجنا گناہ سمجھا جاتا تھا۔ گاندھی جی سے کستوربا کی شادی ان کی زندگی کا نیا موڑ تھا۔ اس کے بعد ہی انھوں نے گجراتی پڑھنا لکھنا سیکھا۔ انھوں نے ٹوٹی پھوٹی انگریزی بولنا بھی سیکھا۔

شادی کے بعد ان کی زندگی عیش کی زندگی نہ تھی۔ گاندھی جی نے ان پر بہت سی پابندیاں لگائی ہوئی تھیں اور ان پر گہری نظر رکھتے تھے۔ کسی سہیلی کے یہاں یا مندر جانے کے لئے بھی شوہر کی اجازت ضروری تھی۔ غریب کستوربا ان پابندیوں کے ساتھ جھوجھ رہی تھیں۔ وہ پرسکون اور مستقل مزاجی کے ساتھ شوہر کی پابندیوں کے ساتھ دن گذارتی رہیں۔ بچپن سے یہی بتایا گیا تھا کہ بیوی کو شوہر کا تابعدار رہنا چاہیئے۔

بہت برسوں کے بعد گاندھی جی نے کہا۔ "میں نے "اہنسا" کا سبق اپنی بیوی سے سیکھا۔ جب میں اپنی مرضی ان پر تھوپنے کی کوشش کرتا تو ایک طرف اس کی پر زور مدافعت اور دوسری طرف میری حماقت پر خاموش خود سپردگی۔ آخر میں اپنے اس خیال پر خود شرمندہ ہوا کہ میں ان پر حکم چلانے کے لئے پیدا ہوا ہوں۔ اور آخر کار اہنسا میں وہ میری استاد بن گئیں۔"

1886 میں ان کی زندگی میں زبردست تبدیلی آئی۔ وہ ماں بنیں اور ہری لال گاندھی پیدا ہوئے۔ منی لال گاندھی 1892 میں پیدا ہوئے۔

ایک سال بعد گاندھی جی کو جنوبی افریقہ میں ایک ملازمت کی پیش کش ہوئی۔ گاندھی جی نے اسے قبول کرلیا۔ مئی 1893 میں وہ ڈربن پہنچے۔ پہلی بار وہ کستوربا اور بچوں کو یہیں چھوڑ کر تنہا گئے تھے۔

جنوبی افریقہ

گاندھی جی بہت تھوڑے سے عرصے کے لیے ڈربن میں رہے اس مختصر سے عرصہ میں ہی انھوں نے وہاں رنگ بھید کی بنیاد پر تعصب کا اندازہ کرلیا۔ وہ ضلع مجسٹریٹ کی عدالت میں یورپی لباس پہن کر پیش ہوئے لیکن انھوں نے بنگالی پگڑی باندھ رکھی تھی۔ مجسٹریٹ نے انھیں حکم دیا کہ یہ پگڑی اتار دیں۔ گاندھی جی نے یہ حکم ماننے سے انکار کردیا اور عدالت سے باہر چلے گئے۔

انھوں نے اس واقعے کی اطلاع اخباروں کو دی اور اس میں اپنے عمل کو صحیح قرار دیا۔ اخباروں نے انھیں بن بلایا مہمان قرار دیا۔ گاندھی جی کو غیر متوقع طور پر اس واقعہ سے خوب

شہرت ملی اور کچھ لوگوں کو ان سے ہمدردی بھی پیدا ہوئی۔

اس واقعے کے ایک ہفتے بعد وہ پریٹوریا گئے جہاں ان کے موکل کا مقامی وکیل رہتا تھا۔ وہ اس وکیل سے کچھ مشورہ کرنا چاہتے تھے۔ پریٹوریا جانے میں انہیں نسلی امتیاز کا پہلی بار تجربہ ہوا۔ وہ فرسٹ کلاس میں سفر کر رہے تھے۔ کہ ایک یورپی مسافر وہاں آیا اور اس نے زبردستی انھیں فرسٹ کلاس کے ڈبے سے نکال دیا اور وہ رات بھر پلیٹ فارم پر ٹھٹھرتے رہے۔

پریٹوریا پہنچنے کے چند دن کے بعد انہوں نے ہندوستانی باشندوں کی ایک میٹنگ بلائی۔ اس میٹنگ میں ٹرانس وال میں ان لوگوں کی حالت کی تصویر کھینچی۔ میٹنگ بہت کامیاب رہی۔ گاندھی جی نے ایک ایسی تنظیم بنانے کی تجویز پیش کی جس کے ذریعہ ہندوستانی لوگوں کی پریشانیوں کا اظہار کیا جاسکے۔

کچھ اور حالات معلوم ہوئے۔ ہندوستانیوں کو جس برے برتاؤ کے ساتھ اورنج فری اسٹیٹ کے بوریا جمہوریہ سے 1888 میں نکالا گیا تھا اس کا پتہ چلا۔ جو چند لوگ وہاں باقی رہ گئے تھے وہ ہوٹل میں بیروں کا کام کر رہے تھے۔ اس مسئلہ میں گاندھی جی کی مصروفیت متواتر بڑھتی رہی۔ مسئلہ یہ تھا کہ ہندوستانیوں کے ساتھ کیسے بہتر برتاؤ کرایا جاسکتا ہے۔

اسی زمانہ میں انہوں نے اس دیوانی مقدمہ کی پیروی بھی کی جس کے لیے وہ جنوبی افریقہ آئے تھے۔ اس مقدمے سے انہیں پتہ چلا کہ جونیر بیرسٹر سینیر بیرسٹر سے کس طرح سیکھتا ہے۔ ان میں یہ خود اعتمادی بھی پیدا ہوئی کہ وہ وکیل کی حیثیت سے ناکام نہیں رہیں گے۔ اس مقدمہ میں وہ کامیاب ہوئے۔ پھر ہندوستان واپس ہونے کے لئے جہاز لینے وہ ڈربن واپس آئے۔

1896 میں گاندھی جی دوبارہ جنوبی افریقہ گئے۔ اس بار کستوربا گاندھی اور ان کے دو بیٹے ان کے ساتھ تھے۔ وہیں ان کے دو اور بیٹے پیدا ہوئے۔ رام داس گاندھی 1897 میں، اور دیوداس گاندھی 1900 میں۔

جنوبی افریقہ میں قیام سے گاندھی خاندان کے رہن سہن میں بہت تبدیلیاں آئیں۔ وہاں پارسی لباس یورپی لباس کے بعد سب سے زیادہ ماڈرن سمجھا جاتا تھا۔ انہوں نے وہاں

پارسی لباس پہننا شروع کیا۔ کستوربا اس تجربہ سے ہرگز خوش نہ تھیں لیکن بار بار کہنے سے انھوں نے اس تبدیلی کو قبول کرلیا۔

گاندھی جی اپنے ساتھی کارکنوں کو بالکل اپنے خاندان کا ممبر سمجھتے تھے۔ اس ملی جلی رہائش کو "فونکس آشرم" کہتے تھے۔ اس طرح کے رہن سہن کا کستوربا کو کوئی تجربہ نہیں تھا چنانچہ اسے اپنانے میں انھیں بڑی دشواری پیش آئی۔

شروع میں گاندھی جی اور کستوربا کے درمیان ایک جھگڑا کھڑا ہوگیا۔ گاندھی جی کا ایک عیسائی کلرک تھا جس کے والدین اچھوت تھے۔ کستوربا نے اس کے جھوٹے برتن صاف کرنے سے انکار کردیا۔ گاندھی جی نے اسرار کیا کہ یہ کام انھیں نہ صرف کرنا ہوگا بلکہ خوشی خوشی کرنا پڑے گا ورنہ انھیں چھوڑ کر چلا جانا پڑے گا۔ ان کے جوش وخروش اور غصے نے انہیں اندھا کردیا تھا۔ انھیں احساس ہی نہیں تھا کہ وہ اپنی بیوی پر کتنا غیر واجب دباؤ ڈال رہے تھے۔ ایک بار پھر کستوربا نے اپنی برداشت کا مظاہرہ کیا اور گاندھی جی کے حکم کے مطابق کام کیا۔ کچھ دن بعد گاندھی جی کو احساس ہوا تو انھوں نے اپنے آپ کو "ظالم مہربان شوہر" کا خطاب دیا۔

گاندھی جی اپنے نظریاتی معیاروں کا اپنی ذات اور اپنے خاندان پر تجربہ کرنا چاہتے تھے۔ کستوربا عام طور پر ان کے خیال کو سمجھ نہیں پاتی تھیں لیکن انھوں نے ہمیشہ وہی کیا جو ان کے شوہر چاہتے تھے شوہر کے سلسلہ میں ہندوستانی روایات کا جو معیار تھا اس پر کستوربا پوری طرح عمل کرتی تھیں۔

جنوبی افریقہ میں ہندوستانی لوگوں کو جن مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا کستوربا اس سے بہت متاثر تھیں۔ ہندوستانی تجارت اور جنوبی افریقہ آنے پر زبردست پابندیاں لگائی گئی تھی۔ کوئی بھی ناٹال میں بغیر لائیسنس کے تجارت نہیں کرسکتا تھا۔ اگر کوئی یورپی لائیسنس لینا چاہتا تو اسے فوراً مل جاتا لیکن ہندوستانی کو بہت کوشش اور اخراجات کے بعد لائیسنس ملتا تھا، وہ بھی اگر ملا تو۔ کسی ہجرت کرنے والے کے لیے یورپی زبان کا جاننا ضروری تھا اور اس طرح ہندوستانیوں کیلئے وہاں جانے کے دروازے بند ہوگئے تھے۔

قانونی پابندیاں تو تھیں ہی لیکن روز مرہ جس توہین آمیز برتاؤ سے وابسطہ پڑتا تھا وہ کہیں زیادہ برا تھا۔ ہر ہندوستانی کو بلاامتیاز قلی کہا جاتا تھا۔ ایک ہندوستانی اسکول ٹیچر کو "قلی اسکول ٹیچر" کہا جاتا تھا۔ ہندوستانی اسٹور کیپر "قلی اسٹور کیپر" تھا اسی طرح گاندھی جی ایک "قلی بیرسٹر" تھے۔ مالدار ہندوستانیوں کے پانی کے جہازوں تک کو قلی جہاز کہا جاتا تھا۔ ہندوستانیوں کو عام طور پر "ایشیا کی قابل نفرت گندگی" کہا جاتا تھا۔ یہ بھی کہا جاتا تھا کہ یہ "چاول کے ساتھ کالی دال کھانے والے" ہیں۔ ہندوستانیوں کو ایشیا کا نیم وحشی بھی کہتے تھے یعنی ایشا کے وہ لوگ جو ابھی غیر مہذب ہیں۔ انھیں فٹ پاتھ پر چلنے کی اجازت بھی نہیں تھی اور وہ رات کو بھی گھر سے باہر نہیں نکل سکتے تھے جب تک ان کے پاس اجازت نامہ نہ ہو فرسٹ اور سکنڈ کلاس ریل ٹکٹ بھی انہیں نہیں دیئے جاتے تھے۔ اگر کوئی گورا مسافر اعتراض کرتا تھا تو ہندوستانی کو ریل کے ڈبہ سے باہر پھینک دیا جاتا تھا۔ گاندھی جی کے ساتھ ایک ایسا واقعہ ہو بھی چکا تھا۔ کبھی کبھی ہندوستانیوں کو ریل کے دروازے کے تختے پر سفر کرنا پڑتا تھا۔ وہ کسی یورپی ہوٹل میں داخل نہیں ہو سکتے تھے۔ ٹرانسوال میں ہندوستانی نہ تجارت کر سکتے تھے نہ رہ سکتے تھے، سوائے کچھ مخصوص بستیوں کے، جن کو ایک بار لندن ٹائمس نے "گھیٹو" کہا تھا۔ (یعنی گندی جاہل بستیاں) اورنج فری اسٹیٹ میں ایک قانون تھا جس کی رو سے ایشیائی اور دوسرے کالے لوگوں پر کسی بھی قسم کی تجارت کرنے پر پابندی تھی۔

یہ سب کچھ کستوربا گاندھی کے لیے ان دیکھے تجربے تھی۔ انہیں بہت افسوس ہوتا تھا جب ایک انسان پر دوسرے کا ظلم دیکھتی تھیں۔ 1897 کا ذکر ہے، انہیں پہلی بار نٹال میں اس خوفناک حقیقت کا پتہ چلا کہ ان کے شوہر کی شہرت ان کے لیے زبردست خطرہ تھی۔ ایک بار ڈربن کی گلیوں میں بغیر کسی قصور کے انہیں پیٹ پیٹ کر ختم کرنے کی کوشش بھی کی گئی تھی۔

گاندھی جی ایک بے چین روح تھے اور سیاست اور سماجی خدمت نے ان کا دل موہ لیا تھا۔ کستوربا نے ہر حال میں جس قدر بھی وہ کر سکتی تھیں ان کی مدد کی۔

ان کا گھر سیاسی لوگوں اور گاندھی جی کے ہم پیشہ لوگوں کیلئے ایک رہائش گاہ تھا اور ان

کی ساری پونجی عوامی کاموں میں خرچ ہوجاتی تھی۔ شروع شروع میں کستوربا کو اس ماحول میں رہنا بہت مشکل لگا۔ انھوں نے بہت دن پہلے اپنے آپ کو زیورات وغیرہ سے چھٹکارے کے لیے ذہنی طور پر تیار کرلیا تھا لیکن اس بات کے لیے کہ ایک بیرسٹر کی بیوی کسان کی بیوی کی طرح رہنے لگے کافی سخت محنت درکار تھی۔

1906 میں گاندھی جی نے ان سے کہا کہ ہم لوگ عہد کریں کہ پوری زندگی اسی طرح گزار دیں گے جیسے غیر شادی شدہ لوگ گزارتے ہیں۔ کستوربا نے اس پر بھی کوئی اعتراض نہ کیا۔ وہ اپنے باہری ماحول میں تبدیلی پہلے ہی قبول کرچکی تھیں، انھوں نے شوہر اور بیوی کے درمیان اس نئے عہد کو بھی قبول کرلیا۔ گاندھی جی نے بعد میں اس تجرد کی زندگی کو خاندانی منصوبہ بندی کا ایک ذریعہ بتایا۔ کستوربا نے ان کے ساتھ تعاون کیا۔

ستیہ آگرہ

1912 میں جنوبی افریقہ میں ہندوستانیوں پر ایک پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ جنوبی افریقہ کے سپریم کورٹ نے ایک فیصلہ کیا کہ جو شادیاں عیسائی طریقہ سے نہ ہوئی ہوں اور شادیوں کے رجسٹرار کے یہاں اندراج نہ ہوا ہو وہ غیر قانونی ہیں۔ اس طرح ہندو مسلم اور تمام غیر عیسائی شادیاں غیر قانونی ہوگئیں اور ان کے بچے ناجائز قرار دیے گئے۔ گاندھی جی نے جنوبی افریقہ کے حکومت سے اپیل کی کہ وہ اس وحشیانہ فیصلہ کو منظور نہ کریں اور قانون میں ترمیم کریں، لیکن گورنمنٹ نے ان کی بات قبول کرنے سے انکار کردیا۔

اب تک عورتوں کو ستیہ آگرہ سے الگ رکھا گیا تھا۔ چونکہ ان کی عزت خطرے میں تھی۔ کستوربا اس توہین کو برداشت نہ کرسکیں۔ کستوربا نے اب تک کسی تحریک میں حصہ نہیں لیا تھا لیکن انھوں نے سمجھ لیا کہ اس معاملہ میں ان پر ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ لہذا انھوں نے بات چیت کرکے بہت سی عورتوں کو تیار کیا تاکہ وہ مردوں کے شانہ بشانہ ستیہ آگرہ میں حصہ لے سکیں۔ یہ عورتوں کی پہلی جدوجہد تھی۔

جنوبی افریقہ کی حکومت کو ان کی مانگ کے سامنے جھکنا پڑا اور ہندوستانی رسموں کے

مطابق کی ہوئی شادیاں قانونی طور پر تسلیم کرلی گئیں۔

1913 میں گاندھی جی کی ہدایت پر کستوربا پندرہ عورتوں کے ساتھ ٹرانسوال گئیں تاکہ وہ ایک دوسرے ستیہ آگرہ میں شریک ہوسکیں۔ 23 ستمبر 1913 کو وہ ٹرانسوال میں داخل ہوئیں اور بغیر اجازت نامہ کے داخلہ کی وجہ سے انہیں گرفتار کرلیا گیا۔ انہیں وہاں غیر سماجی عناصر کے ساتھ رکھا گیا، جن میں چور تھے اور سڑکوں پر غنڈہ گردی کرنے والے لوگ تھے۔

جب وہ قید سے چھوٹیں تو بری طرح بیمار ہوگئیں۔۔ گاندھی جی پریٹوریا میں ایک میٹنگ میں مصروف تھے، انہیں کستوربا کی بیماری کی اطلاع ملی تو وہ میٹنگ ختم کرکے واپس آئے۔

ہندوستان واپسی

جنوبی افریقہ چھوڑ کر گاندھی جی کا خاندان 9 جنوری 1915 کو بمبئی پہونچا۔ فیروز شاہ مہتہ کے محل جیسے مکان میں انہیں استقبالیہ دیا گیا۔ فیروز شاہ مہتہ اس وقت بے تاج بادشاہ تھے۔ اس استقبالیہ میں گاندھی جی کو ہندوستانیوں کی آزادی کا ہیرو اور کستوربا گاندھی کو جنوبی افریقہ کی ہیروئن کہا گیا۔ فیشن ایبل لوگوں کے اس اجتماع میں جو سرکاری افسروں اور تاجروں کی کریم کہا جاسکتا تھا گاندھی جی اپنی پگڑی اور کوٹ، اور کستوربا سادی سی ساڑی پہنے ہوئے تھیں اور وہاں کے لوگوں سے بالکل الگ نظر آرہی تھیں لیکن انہیں اپنے روایتی لباس پر فخر تھا۔

گاندھی جی ہندوستان واپس آکر ایک آشرم قایم کرنا چاہتے تھے۔ گوپال کرشن گوکھلے ان کے دوست، فلسفی اور رہنما تھے۔ انھوں نے آشرم کے لیے رقم مہیا کرنے کا وعدہ کیا لیکن فروری 1915 میں ان کا انتقال ہوگیا۔ گاندھی جی کو ملک کے مختلف حصوں سے آشرم شروع کرنے کی دعوت ملی۔ گاندھی جی نے اس کام کے لیے احمد آباد کو پسند کیا جہاں کپڑے کے کارخانے تھے اور وہ کتائی اور بنائی کے تجربے کے لیے بہترین جگہ تھی۔ انھوں نے وہیں آشرم بنانے کا فیصلہ کیا۔

سابر متی

ستیہ آگرہ کا یہ آشرم جو عام طور پر سابر متی آشرم کہلاتا ہے۔ مئی 1915 میں شروع ہوا۔ اس وقت ایک چھوٹے سے گاؤں کے ایک بنگلہ میں 25 آدمی رہنے لگے۔ اس گاؤں میں جب طاعون کی بیماری پھیلی تو آشرم کو سابر متی دریا کے کنارے ایک محفوظ جگہ پر منتقل کیا گیا۔

آشرم 150 ایکڑ زمین میں پھیلا ہوا تھا۔ اس میں گاندھی جی اور ان کے خاندان کے رہنے کیلئے عمارتیں تھیں۔ استادوں اور ان کے خاندان کے لیے رہنے کی جگہیں تھیں، ایک کھانے کا کمرہ تھا، ایک اسکول تھا ایک لائبریری اور کتائی اور بنائی کے لیے ایک سائبان تھا، جانوروں کے رہنے کے لیے جگہ تھی، سبزیوں اور روئی بونے کیلئے کھیت تھے۔ کستور بانے اور عورتوں کے ساتھ مل کر باورچی خانہ کا کام سنبھال لیا۔ آشرم میں جب ایک پریشانی ختم ہوتی تھی تو دوسری شروع ہو جاتی تھی۔ آشرم میں رہنے والے کچھ لوگ جن میں کستور با بھی شامل تھیں ایک اچھوت فیملی کے آنے پر ناخوش ہوئے، حالانکہ کستور با اپنے شوہر کی مرضی کے مطابق جنوبی افریقہ میں اسے قبول کر چکی تھیں لیکن ان کے چھوا چھوت کے پرانے کٹر خیالات پھر سے ابھر آئے۔ غالباً یہ ہندوستانی ماحول کا اثر تھا۔

گاندھی جی بہت پریشان ہوئے۔ آشرم کے قاعدے سب کے لیے ایک تھے۔ شروع ہی میں اس قاعدہ کا اعلان کیا جا چکا تھا کہ یہاں چھوت چھات قابل قبول نہیں ہے۔ وہ اپنی بیوی کو کوئی ایسا قانون توڑنے کی کیسے اجازت دیتے جو کوئی بھی نہ توڑ سکتا تھا۔ انہوں نے کستور با کے سامنے دو باتیں رکھیں۔ یا انہیں چھوت چھات کے خیال کو چھوڑنا پڑے گا یا پھر وہ آشرم چھوڑنے کے لیے آزاد تھیں۔

کستور با کو اس فیصلے سے بڑا سخت دھکا لگا۔ وہ اپنے شوہر کو بہت اچھی طرح سے جانتی تھیں۔ انہیں معلوم تھا کہ وہ جو کہتے ہیں اس پر عمل بھی کر سکتے ہیں۔ بڑی کوشش کے بعد انہوں نے اس اچھوت خاندان کو آخر اپنا ہی لیا۔ ان کی صلح پسند طبیعت نے ایک بار پھر ان کو فتح بخشی۔

ایک بار گاندھی جی آشرم کے قریب ایک گاؤں میں لوگوں کے سامنے تقریر کرنے کے لیے کھڑے ہوئے اور بے ہوش ہوگئے۔ انھیں آشرم میں لایا گیا۔ انھیں ایک طرح کا بخار ہوگیا تھا۔ ڈاکٹر نے ان سے کہا کہ غذا میں وہ صرف دودھ پئیں۔

گاندھی جی نے کبھی عہد کیا تھا کہ وہ گائے کا دودھ نہ پئیں گے اور دودھ کی بنی کوئی چیز نہ کھائیں گے۔ اس وقت کستوربا نے ان کی مدد کی۔ گاندھی جی کے بستر کے قریب آکر انھوں نے کہا کہ مجھے یقین ہے کہ آپ کو موہنا بکری کا دودھ پینے میں تو کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ بکری کے دودھ نے ان کی زندگی بچالی۔

ڈانڈی اور اس کے بعد

1930 میں حکومت نے نمک بنانے کے لیے لائسنس لگانے کا فیصلہ کیا۔ گاندھی جی نے بغیر لائسنس کے نمک بنانے کی تحریک شروع کی۔ انھوں نے آشرم سے سمندر کے کنارے ڈانڈی تک 380 کلومیٹر کا فاصلہ پیدل طے کیا اور وہاں نمک بنایا۔ یہ سفر ڈانڈی مارچ کے نام سے مشہور ہوا اور یہ عمل "نمک ستیہ آگرہ" کہلایا۔ گاندھی جی کو گرفتار کرلیا گیا۔

جب گاندھی جی جیل میں تھے تو کستوربا گاندھی نے گاؤں کا دورہ کیا۔ کارکنوں سے ملیں جو لوگ پولس کی زیادتیوں سے زخمی ہوئے تھے ان سے اسپتال میں ملیں، ان کے گھروں پر گئیں اور لوگوں میں ہمت اور جوش پیدا کیا۔ جب وہ سابرمتی واپس آئیں تو وہ بہت رنجیدہ تھیں۔ انھوں نے اس دورے کے درمیان لوگوں کی پریشانیاں دیکھیں جن سے وہ خود پریشان ہو اٹھیں۔ پھر بھی ان کے چہرے سے مضبوطی اور اعتماد جھلک رہا تھا۔ اب ماں ستیہ آگرہ کی سپاہی تھیں اور ناانصافی کے خلاف سخت جنگ میں مصروف تھیں۔

وہ سیاست سے واقف نہ تھیں۔ وہ تو صرف گاندھی جی کو جانتی تھیں۔ ان کے لئے یہ کافی تھا کہ گاندھی جی اس جدوجہد کے رہنما ہیں اور انھوں نے اپنے آپ کو جان ودل کے ساتھ اس لڑائی میں جھونک دیا تھا۔ وہ بیکار بیٹھنا نہ جانتی تھیں اور صبح سے شام تک ہر قسم کے گھریلو کام کرتی تھیں۔ بیماروں کی تیمارداری، کارکنوں سے بات چیت، ان کی گھریلو اور

ذاتی پریشانیوں پر گفتگو کرتیں اور مشورہ دیتی تھیں۔ اس کے علاوہ وہ ہمیشہ گاندھی جی کی ضرورتوں کا خیال بھی رکھتی تھیں۔

کستوربا مذہبی اور خدا کا خوف رکھنے والی خاتون تھیں۔ وہ ہمیشہ پوجا کے لیے صبح چار بجے اٹھتی تھیں۔ گاندھی جی صبح کی سیر کے لیے جاتے تو وہ نہالیتی تھیں۔ اس کے بعد وہ تقریباً ایک گھنٹہ تک رامائن اور گیتا پڑھتی تھیں۔ کستوربا کی مستقل پریشانی اپنے بڑے بیٹے ہری لال کے سلسلے میں تھی۔

ہری لال کا مسئلہ کچھ غیر معمولی تھا اور اس کی عادتیں کستوربا کو بہت پریشان رکھتی تھیں۔ ایک بار انہوں نے کہا تھا کہ ان کی زندگی کے لیے سب سے بڑی ناکامی ہری لال تھا۔ اس نے اپنے والدین سے بغاوت کی اور ان سے سارے رشتے توڑ لیے۔

1925 میں گاندھی جی کو ایک خط ملا جس میں لکھا تھا کہ ایک کمپنی جس کا نام آل انڈیا اسٹورس لمیٹیڈ تھا اور ہری لال اس کمپنی کے ڈائرکٹروں میں سے ایک تھا۔ یہ کمپنی جعلی ثابت ہوئی ہے۔ گاندھی جی نے اس پر کہا "میرے لئے ستیہ آگرہ کا قانون اور محبت کا قانون آسمانی قانون ہیں۔ میں ہر اس چیز کے ساتھ تعاون کرتا ہوں جو اچھی ہے اور ہر اس چیز کے ساتھ تعاون نہیں کرنا چاہتا جو بری ہے، چاہے وہ میری بیوی سے متعلق ہو، میرے بیٹے سے متعلق ہو یا خود مجھ سے متعلق ہو۔"

چاہے بیٹا کیسا بھی ہو ماں کے لئے اس سے لاتعلقی باپ کے مقابلہ میں مشکل ہے۔ جب ایک بار کستوربا نے سنا کہ ہری لال کو سزا ہوئی ہے، اس جرم میں کہ وہ شراب پیئے ہوئے لوگوں میں گھس آیا تھا، تو انہوں نے اسے لکھا اور درخواست کی کہ وہ اپنے آپ کو ایک کمزور بوڑھی عورت، جو اس غم کو برداشت نہیں کر سکتی، اس کی خاطر سدھار لے۔

بدقسمتی سے ہری لال کبھی ٹھیک نہ ہوا۔ اپنی موت سے ایک دن پہلے کستوربا نے کسی سے کہا کہ ہری لال کو لاؤ۔ وہ ان کے بستر کے قریب لایا گیا، اس وقت بھی وہ شراب پیئے ہوئے تھا۔ اس حالت میں اسے دیکھ کر وہ اور پریشان ہو گئیں اور اسے جلدی ہی ان کے پاس سے ہٹا دیا گیا۔

ستمبر 1932، یراودہ کی جیل میں گاندھی جی نے بے مدت بھوک ہڑتال کی۔ ان کا یہ احتجاج اچھوتوں کو الکشن میں ایک الگ گروپ بنانے کے خلاف تھا۔ ان کے اس ارادے سے پورا ملک حیران رہ گیا اور لوگوں نے ان کے ساتھ فاقہ کیا۔ 24 گھنٹے کے اندر ان کی حالت بگڑنے لگی۔ تیسرے دن وہ موت کے بالکل قریب پہنچ گئے۔ ان کی بھوک ہڑتال کے دنوں میں مندروں کے دروازے اچھوتوں کے لئے کھول دیئے گئے جو صدیوں سے ان کے لئے بند تھے۔

بھوک ہڑتال

کستوربا گاندھی جی کی بھوک ہڑتال کی وجہ نہ سمجھ سکیں پھر بھی انہوں نے اس میں حصہ لیا۔ وہ صرف اتنا کھاتی تھیں کہ ان میں تھوڑی سی طاقت باقی رہے تاکہ وہ گاندھی جی کی خدمت کر سکیں۔

1933 میں نیویارک ٹائمس نے لکھا کہ کسی انجانے جرم پر کستوربا گرفتار کرلی گئیں، انہیں تنبیہ کی گئی کہ وہ سابرمتی آشرم کو چھوڑ کر کسی دوسرے شہر میں رہنے لگیں اور سول نافرمانی سے باز آئیں۔ انہوں نے انکار کردیا اور انگریزی حکومت نے انہیں جیل میں ڈال دیا۔

گاندھی جی نے پھر مرن برت کا اعلان کیا۔ اس بار بھی ہریجنوں کا ہی معاملہ تھا۔ کستوربا نے بھی اس احتجاج میں ان کا ساتھ دیا۔ جس دن انہوں نے بھوک ہڑتال شروع کی اسی دن انہیں پندرہ عورتوں کے ساتھ گرفتار کرلیا گیا۔ بعد میں انہیں چھوڑا گیا لیکن پھر گرفتار کرلیا گیا، اس لئے کہ وہ اپنے شوہر کی بھوک ہڑتال کے بارے میں بیانات دیتی رہتی تھیں۔

تین مہینہ پہلے ان کے سب سے چھوٹے بیٹے دیوداس نے لکشمی سے شادی کی۔ لکشمی راج گوپال آچاری کی بیٹی تھیں۔ یہ شادی ہندو مذہبی اصول کے مطابق ہوئی تھی اور بعد میں سول تقریب بھی ہوئی تھی۔ کستوربا کو ایک روایتی ہندو شادی میں شرکت کی خوشی تھی۔

اس کے فوراً ہی بعد انہیں گرفتار کرلیا گیا اور جیل میں ڈال دیا گیا۔ بعد میں انہیں بار بار

گرفتار کیا گیا۔ اب ان کی عمر تقریبا 65 سال تھی۔ انہوں نے اپنی عمر کی وجہ سے کبھی رعایت کے لئے نہیں کہا، انہوں نے جیل میں اسی زمانے میں خود بھوک ہڑتال کی جب گاندھی جی اپنی جیل میں بھوک ہڑتال کر رہے تھے، صرف اس لئے کہ ان کے شوہر بھوک ہڑتال پر تھے۔ گوکہ اپنے دل سے وہ کبھی گاندھی جی کے اچھوتوں کے بارے میں خیال سے متفق نہیں ہوئیں۔

فروری 1933 میں جب گاندھی جی سابرمتی جیل میں تھے تو بہت بیمار ہوگئے۔ بہت سے لوگ ان سے ملنے کے لئے گئے۔ ان ملنے والوں میں جواہر لال نہرو، سروجنی نائیڈو، وجے لکشمی پنڈت اور عظیم شاعر رابندر ناتھ ٹیگور بھی شامل تھے۔

کستوربا، گاندھی جی کے پاس لائی گئیں انہوں نے آہستہ سے کہا "اس بار میں نہیں بچوں گا مگر تم پریشان نہ ہونا اور نہ رونا پیٹنا" وہ بھی گاندھی جی کے ساتھ برت رکھ رہی تھیں۔ گردن کے اشارے سے ہاں کہہ دیا لیکن روئی نہیں۔ گاندھی جی نے ان سے کہا کہ تھوڑا بہت دنیاوی سامان جو کچھ ان کے پاس ہے لے آؤ اور جو لوگ وہاں موجود ہیں ان میں تقسیم کردو۔ اگلے دن وہ سب کچھ لے آئیں جو گاندھی جی کا تھا۔ ان چیزوں میں ایک جوڑا چپل، چشمہ، ایک دھوتی، ایک سوتی شال اور ایک بڑی گھڑی شامل تھیں۔ کستوربا نے پرارتھنا کی۔

ایک انگریز پادری سی۔ ایف۔ انڈریوز جو گاندھی جی کے دوست اور فلسفی تھے اور گاندھی جی کے سچے چیلے تھے کستوربا کے پاس آئے اور ان سے کہا کہ حکومت آپ کے شوہر کو آزاد کررہی ہے۔ آخرکار گاندھی جی نے اپنا فاقہ توڑلیا۔ کستوربا نے پانی ملا سنترے کا عرق قطرہ قطرہ کرکے انہیں پلانا شروع کیا۔ انہوں نے گاندھی جی سے درخواست کی کہ ان کے ہاتھ سے وہ کچھ غذا لے لیں۔ گاندھی جی نے اقرار میں اپنا سر ہلادیا۔ ایسا لگا کہ جیسے وہ کہہ رہے ہوں کہ "وہ لڑائی جاری رکھنے کیلئے زندہ رہنا چاہتے ہیں۔"

15 اپریل 1935 کو گاندھی جی نے واردھا کے قریب ایک گاؤں میں ایک جھونپڑی لی۔ وہ جگہ آج کی دنیا سے دور، آدمی کی بالکل ابتدائی زمانہ کی معلوم ہوتی تھی۔ نہ وہاں ریل کی پٹری تھی نہ پوسٹ آفس تھا۔ کوئی دوکان بھی نہیں تھی۔ انہوں نے یہ گاؤں اس لئے چنا تھا

کہ وہاں کی زیادہ تر آبادی اچھوتوں کی تھی۔ وہاں انھوں نے اکیلا رہنا چاہا اور کستوربا کو بھی ساتھ نہیں لیا۔ کستوربا کو بچوں اور دوستوں کی دیکھ بھال کے لئے چھوڑ دیا گیا۔

اس مہینہ بمبئی میں کستوربا کے اعزاز میں ایک عام جلسہ کیا گیا۔ سروجنی نائیڈو نے جلسہ کی صدارت کی۔ انھوں نے اپنی بات اس اعلان کے ساتھ شروع کی کہ "یہ میرے لیے فخر کی بات ہے کہ میں کستوربا جی کی شان میں اس جلسہ میں شریک ہوں۔"

انھوں نے کہا "تمام ہندوستانی عورتوں کو چاہیئے کہ وہ کستوربا جیسی عظیم ہستی کا پورا پورا ساتھ دیں، جس عظیم ذات نے اپنی روح، ہمت، لگن اور قربانی سے ہندوستانی عورت کی زبردست روایات کو باقی رکھا اور زندہ کیا ہے۔"

سروجنی نائیڈو نے جنوبی افریقہ میں کستوربا کی زندگی کا ذکر کیا۔ ان کے قید ہونے کا ذکر کیا اور ان تجربات کا ذکر کیا جو انھوں نے ہندوستانی جیل میں حاصل کیے تھی۔ انھوں نے اعلان کیا کہ گاندھی جی کو ایک مددگار ساتھی ملا ہوا ہے جس کی وجہ سے وہ بہت سا کام کرپائے ہیں۔ صدر جلسہ نے اس بات پر خاص طور پر زور دیا کہ کستوربا نے گاندھی جی کی خواہشات اور انداز فکر کو قبول کیا اور کبھی یہ نہ پوچھا کہ جو کچھ وہ کررہے ہیں وہ کس لئے ہے اور اس سے کیا فائدہ ہے۔ کستوربا نے اپنے شوہر کے مقصد کو تقویت پہونچائی اور قربانی اور ہمت افزائی کی جو صرف مائیں کرسکتی ہیں۔ کستوربا جوابی تقریر کے لیے کھڑی نہ ہوئیں۔ ان کے چہرے پر ایک شریفانہ انکساری تھی اور وہ خاموشی سے اپنی تعریفیں سنتی رہیں۔

1938 میں راج کوٹ کی حکومت نے لوگوں کو کچھ سیاسی حقوق دینے کا وعدہ کیا لیکن بعد میں وعدہ سے پھر گئی۔ اس وعدہ خلافی کے خلاف احتجاج کے طور پر لوگوں نے ستیہ آگرہ کا فیصلہ کیا۔ جیسے ہی کستوربا نے سنا انھوں نے اس ستیہ آگرہ میں حصہ لینا چاہا۔ گاندھی جی کی اجازت سے انھوں نے حصہ لیا اور وہ راج کوٹ میں گرفتار کرلی گئیں۔ شروع میں کستوربا کو ایک چھوٹے سے گاؤں میں رکھا گیا۔ جب دیو داس گاندھی ان سے ملنے گئے تو انہیں اس بات سے بہت تکلیف ہوئی کہ ان کی بوڑھی ماں کو قید تنہائی میں اس طرح رکھا گیا ہے کہ اس عمر میں ان کے آرام اور ضرورتوں کی طرف کوئی توجہ نہیں ہے۔ لیکن کستوربا نے کبھی

کوئی شکایت نہ کی۔ وہ وہاں آزادی کے ایک عدم تشدد کو ماننے والے سپاہی کی حیثیت سے گئی تھیں اور ان کا اعتقاد تھا کہ ایک سپاہی کو تکلیفوں سے گھبرانا نہ چاہیئے۔

گاندھی جی راج کوٹ سے کلکتہ گئے اور وہاں سے بہار، جہاں گاندھی سیوا سنگ کا سالانہ اجلاس ہونے والا تھا۔ کستوربا ان کے ساتھ تھیں۔ واپسی میں انھیں دلی میں روکنا پڑا۔ دلی میں کستوربا پر جاڑے بخار کا حملہ ہوا۔ ڈاکٹروں نے مشورہ دیا کہ سفر جاری نہ رکھیں لیکن انہوں نے کہا کہ گاندھی جی کے ساتھ سفر کرنے میں وہ بہت آرام محسوس کرتی ہیں، لہذا گاندھی جی انھیں اپنے ساتھ لے گئے۔ ٹرین میں ان کی حالت زیادہ خراب ہوگئی۔ لیکن وہ پریشان نہیں تھیں وہ جب کبھی گاندھی جی کے ساتھ ہوتی تھیں تو وہ اپنے آپ کو پوری طرح محفوظ سمجھتی تھیں۔

جب وہ راج کوٹ پہونچے تو ڈاکٹر سوشیلا نیر نے ان کا علاج کیا اور ان کا بخار اتر گیا۔ ریل کے لمبے سفر نے ان کے صحت پر برا اثر ڈالا تھا۔ ان پر کھانسی کے ساتھ نمونیہ کا بھی حملہ ہوا۔ انہیں بیماری سے تو نجات مل گئی لیکن ان کی عام صحت اتنی خراب ہوگئی کہ وہ بار بار بیمار ہونے لگیں۔ کچھ دنوں کے بعد کستوربا پھر بیمار ہوگئیں۔ قید کے زمانے میں ان کی صحت بہت گرگئی تھی لیکن ان کے چہرے پر پریشانی کے اثرات دکھائی نہ دیتے تھے۔ اب ان کے چہرے پر جھریاں پڑگئی تھیں۔ گاندھی جی نے ڈاکٹر سوشیلا نیر کو دلی تار دیا اور اس میں لکھا کہ کستوربا ان ہی سے علاج کرانا چاہتی ہیں۔

جب کستوربا دلی پہنچیں تو ڈاکٹر سوشیلا نیر کو ایک دھکا سا لگا کہ انہوں نے تنہا سفر کیا تھا۔ کستوربا کو کھانسی اور نمونیہ تھا۔ ہاضمہ کا نظام بہت دن سے خراب تھا۔ اس سے پریشانی اور بڑھ گئی تھی۔ کستوربا کو اپنی صحت کی فکر نہیں تھی۔ جب ڈاکٹر سوشیلا نیر نے ان سے پوچھا کہ جب ان کی طبیعت خراب تھی تو انہوں نے اکیلے سفر کیوں کیا تو کستوربا نے جواب دیا۔ فکر کی کیا بات تھی انہوں نے مجھے دوسرے مسافروں کے نگرانی میں ٹرین میں بیٹھا دیا۔ اور یہاں تم مل گئیں۔ میں تو ٹرین میں صرف بیٹھی رہی کیا اس کے لئے بھی لوگوں کا ساتھ ہونا ضروری ہے۔

بیماری

کستوربا کی بیماری خطرناک حد تک پہونچ گئی۔ ڈاکٹر سوشیلا نیر کو گاندھی جی روزانہ خط لکھتے تھے جس میں کستوربا کے صحت کے سلسلہ میں پوچھا جاتا تھا۔ وہ خط محبت بھرے ہوتے تھے۔ جب کوئی خط ملتا تھا تو کستوربا کے چہرے پر رونق آجاتی تھی۔ وہ ڈاکٹر سوشیلا نیر کا انتظار کرتی تھیں تاکہ وہ خط پڑھ کر سنادیں۔ اس کے بعد وہ خط کو تکیہ کے نیچے رکھ لیتی تھیں۔ بعد میں وہ اپنا چشمہ لگاتیں اور خط کو لفظ بلفظ پڑھتیں۔ ڈاکٹر سوشیلا نیر کا کہنا ہے کہ ان خطوں کی بدولت کستوربا بچ گئیں۔ ان کی بیماری تو دور ہوگئی تھی لیکن وہ بہت کمزور ہوگئی تھیں۔

8 اگست 1942 کو بمبئی میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اجلاس میں "ہندوستان چھوڑدو" تجویز پاس ہوئی۔

شیواجی پارک میں اگلے دن گاندھی جی کو تقریر کرنی تھی لیکن وہ صبح ہونے سے پہلے گرفتار کرلیئے گئے۔ کستوربا نے اعلان کیا کہ وہ گاندھی جی کی جگہ تقریر کریں گی۔ پولس نے انھیں پیغام بھیجا کہ اگر انہوں نے تقریر کرنی چاہی تو وہ بھی گرفتار کرلی جائیں گی۔

کستوربا نے اس کی کوئی پرواہ نہ کی اور پارک کی طرف روانہ ہوئیں لیکن جیسے ہی وہ ڈاکٹر سوشیلا نیر کے ساتھ دروازہ سے باہر آئیں پولس کے ایک سپاہی نے ان کا راستہ روک لیا اور کہا "اماں تم بہت بوڑھی ہو، یہ کام تمہارے کرنے کے نہیں ہے، اس عمر میں تم گھر بیٹھو، مہربانی کرکے میٹنگ میں نہ جاؤ۔"

پولس کے سپاہی کی باتوں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے کستوربا کار کی طرف بڑھیں۔ اس پر سپاہی نے ان دونوں کو گرفتار کرلیا اور وہ پونا کے آغا خاں پیلس میں بھیج دی گئیں جہاں گاندھی جی قید تھے۔

دوسری جیلوں میں انہیں دوسرے قیدیوں سے ملنے کی اجازت ہوتی تھی۔ وہ ان لوگوں سے بات چیت کرسکتی تھیں۔ قیدی ان کے پاس آجاسکتے تھے۔ لیکن یہاں آغا خان

پیلس میں سیاسی قیدیوں کا ایک چھوٹا سا گروپ الگ رکھا گیا تھا۔ کستور با کو اپنے بیٹوں اور پوتے پوتیوں سے بھی ملنے کی اجازت نہیں تھی اور نہ وہ انہیں خط لکھ سکتی تھیں۔

وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ وہ کمزور اور پیلی پڑتی چلی گئیں۔ اپنی مکمل بے کاری سے وہ کچھ خوفزدہ سی رہنے لگیں۔ شروع شروع میں وہ اپنے شوہر کے بستر کے پاس بیٹھ کر پنکھے سے مکھی اور مچھر اڑاتی رہتی تھیں جو وہاں بہت تھے۔

کستور با قید میں بھی اکادشی اور پورے چاند کے دن کا فاقہ کیا کرتی تھیں چونکہ وہ کلنڈر نہیں دیکھ سکتی تھیں اس لئے گاندھی جی نے ایک کلنڈر پر پورے چاند کے دنوں پر لال دائرہ بنا دیا تھا۔

ان کی پوتیوں میں سے ایک کو ان کے پاس آنے کی اجازت آخرکار مل ہی گئی۔ وہ دونوں ٹہل ٹہل کر باتیں کرتیں اور آشرم کے لوگوں کے بارے میں ایک دوسرے کو بتاتیں۔ کستور با اپنے بیٹوں اور ان کے بچوں کے حال چال پوچھتیں۔ اس سے کستور با کے چہرے پر پھر رونق نظر آنے لگتی۔

کستور با بڑی معصوم خاتون تھیں۔ اپنے سیدھے پن میں وہ کبھی کبھی گاندھی جی سے جھگڑ پڑتی تھیں۔ ایک دن انہوں نے جھلا کر گاندھی جی سے کہا "کیا میں نے تمہیں روکا نہیں تھا کہ اتنی طاقتور حکومت سے جھگڑا مت مول لو۔ لوگ کب تک برداشت کریں گے۔ روزانہ ہزاروں آدمی گرفتار ہوتے ہیں یا قتل ہوتے ہیں۔ اس سب کا نتیجہ کیا ہوگا؟" گاندھی جی خاموشی سے سنتے رہے۔

کچھ دن بعد انہوں نے گاندھی جی سے نرمی کے ساتھ پوچھا "تم کیوں چاہتے ہو کہ انگریز ہندوستان سے چلے جائیں۔ ہمارا ملک بہت بڑا ہے ہم سب یہاں بھائیوں کی طرح رہ سکتے ہیں۔"

گاندھی جی نے جواب دیا "میں نے اس کے علاوہ کیا کیا ہے؟ میں چاہتا ہوں کہ وہ یہاں حاکم بن کر نہ رہیں۔ جب وہ ہمارے حاکم نہ رہیں گے تو ہمارا ان سے کوئی جھگڑا بھی نہ رہے گا۔"

تنہائی کی زندگی سے تنگ آکر ایک دن گاندھی جی نے وائسرائے لارڈلن لتھ گو کو خط لکھا۔ اس خط میں انہوں نے لکھا تھا کہ انہیں عوام سے بالکل الگ تھلگ کردیا گیا ہے۔ اس کے خلاف وہ بھوک ہڑتال کریں گے۔ یہ خط لکھ لیا گیا تھا لیکن ابھی ڈاک میں ڈالا جانا باقی تھا۔

ان کے اس ارادے کی خبر پھیل گئی۔ ڈاکٹر سوشیلا نیر نے ان سے پوچھا کہ کیا اس بھوک ہڑتال سے ان کی صحت اور خراب نہیں ہوجائے گی۔ کستوربا نے گاندھی جی سے کہا کہ وہ بھوک ہڑتال نہ کریں۔ قید خانہ کے برامدے میں ایک تلسی کا گملہ تھا۔ وہ اس گملے کے سامنے گئیں اور گھٹنوں کے بل جھک کر دعا کی کہ ان کے شوہر بھوک ہڑتال نہ کریں۔ سروجنی نائیڈو نے گاندھی جی سے کہا کہ اگر انہوں نے بھوک ہڑتال کی تو کستوربا مرجائیں گی۔

گاندھی جی ہنسے اور کہا۔ میں انھیں تم سے زیادہ جانتا ہوں۔ تمہیں نہیں معلوم کہ وہ کتنی بہادر ہیں۔ میں نے ان کے ساتھ باسٹھ سال گذارے ہیں۔ اور سنو، وہ اسے تم لوگوں سے بہتر طور پر برداشت کرلیں گی۔"

آغا خاں پیلس میں پہلا حادثہ ہوا۔ گاندھی جی کے پرائیوٹ سکریٹری مہادیو ڈیسائی کا 15 اگست 1942 کو انتقال ہوگیا۔ گاندھی جی کے لئے یہ بہت بڑا صدمہ تھا کیونکہ قابل، محنتی اور خوش مزاج مہادیو 1917 سے ان کے ساتھ تھے۔ گاندھی جی انھیں ایم۔ ڈی۔ کہتے تھے۔ وہ گاندھی جی سے علیحدگی کا تصور بھی نہ کرسکتے تھے۔ ان کی موت گاندھی جی اور کستوربا کے لئے ناقابل برداشت نقصان تھا۔

جیل میں انتقال

کستوربا کی صحت کافی دن سے خراب چل رہی تھی۔ گاندھی جی کو اس کی بہت فکر تھی۔ بہت سے ڈاکٹروں نے ان کا علاج کیا۔ ان ڈاکٹروں میں ڈاکٹر گلڈر، ڈاکٹر ذلشان اور ڈاکٹر سوشیلا نیر شامل تھیں۔ ایک آیورویک وید بھی ان کی مکمل دیکھ بھال کرتا تھا۔ اس سب کے باوجود

کستوربا کی صحت دن بدن گرتی گئی اور آخر 22 فروری 1944 کو اپنے شوہر کی گود میں پونا کے آغا خاں پیلس میں انہوں نے دم توڑ دیا۔

"اب میں جا رہی ہوں۔ ہم نے بہت سی خوشیاں اور غم ساتھ ساتھ گذارے ہیں۔" ان کی آخری خواہش تھی کہ انہیں گاندھی جی کے کاتے ہوئے سوت کی ساری پہنا کر جلایا جائے۔ لارڈ ویول کے تعزیتی خط کے جواب میں گاندھی جی نے لکھا تھا کہ "ہمارا جوڑا فی الحقیقت ایک غیر معمولی جوڑا تھا۔"

گاندھی جی کو یقین نہیں آتا تھا کہ ان کی بیوی، جنھیں ہر صورت میں ان کا نصف بہتر کہا جا سکتا تھا، ان سے الگ ہو گئی ہیں۔ گاندھی جی خاموش بیٹھے ہوئے 62 سال کی شادی شدہ زندگی کے واقعات کو سوچتے رہتے تھے۔ اس کے باوجود کہ ان دونوں کے درمیان بہت بڑا ذہنی فاصلہ تھا انہوں نے کستوربا کے خیالات کا احترام کرنا سیکھ لیا تھا اور انہیں اپنے بارے میں فیصلے کرنے کی اجازت دے دی تھی۔

ان کی موت سے ان کے آزادی کے سلسلے کے سارے کام — جنوبی افریقہ اور ہندوستان کا ستیہ گرہ، عدم تعاون کی تحریک میں ان کی گرفتاری، راج کوٹ کا احتجاج، اب یہ سب خوشگوار یادگاریں بن چکی تھیں۔

کستوربا ایک مکمل ہندو بیوی تھیں۔ وہ نہ صرف گاندھی جی کی خوشیوں اور غموں میں شریک تھیں بلکہ محدود طور پر ان کے سیاسی اور سماجی ترقی کے کاموں میں بھی حصہ دار تھیں۔

ان کا سارا کام صرف سیاسی میدان میں ہی نہیں تھا۔ حقیقت میں ان کا خاندان گاندھی جی کے شاگرد اور ساتھی تھے اور آشرم ان کا گھر تھا۔ انہوں نے کوشش کی کہ وہ گاندھی جی اور ان کے کاموں میں خود کو بالکل گم کر دیں۔

جب ان کے شوہر کھانا کھاتے تھے یا اپنی جھونپڑی میں بیٹھے رہتے تھے تو وہ اپنے شوہر کو پنکھا کرتی رہتی تھیں۔ اس وقت وہ خدمت اور وفا کی تصویر ہوتی تھیں۔

کستوربا ایک مضبوط شخصیت کی مالک تھیں۔ ان کی قوت ارادی کچھ ایسی ہی مضبوط تھی

کہ وہ نہ جھک سکتی تھی نہ ٹوٹ سکتی تھی۔ گاندھی جی نے ستیہ آگرہ کے معاملہ میں انھیں اپنا استاد کہا ہے۔ کسی ترقی یافتہ یا بہت باشعور خاندان سے تعلق نہ رکھنے کے باوجود صرف خود کو اس مقصد کے لیے پوری طرح وقف کردینے کے جذبے کے ساتھ جسے گاندھی جی نے اپنا مقصد زندگی بنالیا تھا، انھوں نے اپنی پوری زندگی مادر وطن کی نذر کردی۔

ان کی موت سے بہت سے لوگوں میں ملک کی خدمت کا جذبہ پیدا ہوا۔ ان کی یادیں ملک کے نوجوانوں کی آنے والی نسلوں کو متاثر کرتی رہیں۔

وٹھل بھائی پٹیل

برندا گِل

کسی دوسرے ہندوستانی کو غیر ملکوں میں اتنی سرکاری اہمیت نہ ملی اور کسی کا اتنا پر جوش خیر مقدم نہ ہوا جتنا وٹھل بھائی پٹیل کا۔ انہوں نے کالجوں میں تھیٹروں میں چرچوں میں اور کلبوں میں اور مختلف جماعتوں میں جو تقریریں کی تھیں ان میں انہوں نے ہندوستان کی آزادی کا معاملہ بہت بے خوفی اور صفائی کے ساتھ پیش کیا۔ سچ تو یہ ہے کہ انہوں نے لوگوں کے ذہنوں میں ہندوستان کی ایک نہ مٹنے والی تصویر بنادی اور یہ کہ ہندوستانی خود حکومت کرنے کے اہل ہیں اور آزادی جلد سے جلد ملنی چاہیے۔

جے ٹی سنڈرلینڈ

وٹھل بھائی پٹیل

مرکزی گجرات میں جنوب میں دریائے ماہی اور شمال میں دریائے میثو کے درمیان ایک علاقہ ہے جسے ضلع کھیڑا کہتے ہیں۔ کھیڑا کی زرخیز زمین اور مناسب بارش نے لوگوں کو کھیتی باڑی کی طرف متوجہ کیا۔ وہ لوگ محنتی تھے۔ انہوں نے بدل بدل کر فصلیں اگائیں زمین سے پانی نکال کر آب پاشی کی اور زراعت کو منافع بخش بنایا۔ وہ لوگ ان کوششوں کی بدولت خوشحال ہوگئے۔

کرماسد گاؤں میں ایک کسان کے گھر دو لڑکے پیدا ہوئے۔ دونوں بڑے ہوکر شاندار آدمی بنے۔ انہوں نے ہندوستان کی آزادی میں حصہ لیا۔ کہا جاتا ہے کہ ان کے والد جوبری بھائی پٹیل نے 1857 کی آزادی کی جنگ میں حصہ لیا تھا۔ بڑا لڑکا وٹھل 27 ستمبر 1873 کو پیدا ہوا تھا اور چھوٹا ولبھ 21 اکتوبر 1875 کو۔ وہ دونوں ساتھ ساتھ اسکول جاتے تھے۔

پانڈیہ اسکول میں ان کے پرائمری کے ٹیچر سنسکرت میں بہت قابل تھے۔ وہ اکثر رامائن اور مہابھارت کے قصے سنایا کرتے تھے قدیم ہندوستان کی دوسری کہانیاں بھی بیان کرتے تھے اور اس بات پر زور دیتے تھے کہ بچے ان کہانیوں سے سبق حاصل کریں۔ ان کی اس کوشش سے دونوں بھائیوں میں پڑھنے کا شوق پیدا ہوا۔ وہ گھنٹوں کتابیں پڑھتے تھے اور انسانی قدریں سیکھنے کی کوشش کرتے تھے۔

دونوں بھائیوں کا حافظہ بہت اچھا تھا۔ وٹھل بھائی اپنے خیالات کے اظہار میں قدیم کتابوں سے واقعات کے حوالے دیا کرتے تھے جس سے ان کے عزیز و اقربا خوش بھی ہوتے

تھے اور حیرت بھی کرتے تھے۔ ان کے استاد کاہن داس نے پوری پوری کوشش کی کہ ان کے شاگرد محنتی بنیں، کلاسکی چیزوں کو پڑھیں اور نظم و ضبط کے پابند رہیں۔ استاد کی کوششوں نے نوجوان وٹھل بھائی کو بہت متاثر کیا۔ ان کے دوسرے ساتھیوں پر بھی اچھا اثر پڑتا تھا۔

وٹھل بھائی شطرنج بہت اچھی کھیلتے تھے۔ وہ اپنے والد کے ساتھ شطرنج کھیلتے تھے اور بہت عمدہ چالیں چلتے تھے۔ آگے چل کر اس قابلیت نے ان کی ذہانت پر اثر ڈالا اور وہ جو چاہتے تھے اسے اچھی طرح حاصل کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ ان کے مخالف ہمیشہ ان سے پیچھے رہے اور ان کے خیالات کی اونچائی تک نہ پہونچ پائے۔

وٹھل بھائی گھنٹوں گاؤں کے مندر میں خاموش بیٹھے رہتے تھے۔ اس سے انہیں موقع ملا کہ وہ اپنے آپ کو کھنگال سکیں۔ ان کے والدین سوامی نارائن فرقہ کو ماننے والے تھے جو خدمت خلق کی تبلیغ کرتا تھا۔ یہ خیالات بھی نوجوان لڑکے میں سرایت کر گئے۔ وہ بہت نظم وضبط کے پابند تھے اور پڑھنے میں تیز تھے، اس کے باوجود ان میں مزاح کا مادہ بھی تھا۔ یہ خصوصیت ان کے ساتھ ہمیشہ رہی جب وہ گورنمنٹ ہائی اسکول ناڈیاڈ میں پڑھتے تھے تو ان کے مزاح کا یہ پہلو سامنے آیا۔

ایک بار وٹھل بھائی نے امتحان میں لفظ بلفظ وہی لکھ دیا جو ان کے کورس کی کتاب میں تھا۔ چنانچہ ان پر نقل کرنے کا الزام لگایا گیا۔ پھر جب ان سے یہ ثابت کرنے کے لئے کہا گیا کہ انہوں نے نقل نہیں کی ہے تو وہ قہقہہ مار کر ہنسنے لگے۔ اس پر استاد بہت ناراض ہوئے۔ ان سے کہا گیا کہ وہ ایک اس سے پہلے نہ پڑھی ہوئی عبارت زور سے پڑھیں اور پھر اسے کاغذ پر لکھ دیں۔ وٹھل بھائی نے بغیر کسی دقت کے لکھ دیا جس سے ان کے ہیڈ ماسٹر نے خاصی ناگواری محسوس کی۔

ان میں ایک عجیب عادت تھی، جو پوری زندگی باقی رہی۔ اگر ان سے کوئی سوال کیا جاتا تھا تو وہ اس کا الٹ بیان کرنا شروع کر دیتے تھے۔ جب ان سے ہندوستان میں انگریزوں کی حکومت کے فائدے کے سلسلہ میں پوچھا گیا تو انہوں نے انگریزی حکومت کے نقصان گنا دیئے۔

امتحان کے بارے میں سنجیدہ نہ ہونے کی وجہ سے وہ فائنل امتحان میں فیل ہوگئے۔ پھر انھوں نے اپنی غلطی کو محسوس کیا اور امتحان پاس کرنے کے لیے ڈٹ کر محنت کی۔

ان کی آگے کی تعلیم کے اخراجات برداشت کرنے کی ان کے خاندان میں طاقت نہ تھی۔ انھوں نے طے کیا کہ وہ ضلع کچہری میں وکالت کریں گے۔ اس مقصد کو سامنے رکھ کر انھوں نے بمبئی میں گوکھلے کے قانون کالج میں داخلہ لے لیا۔ 1895 میں امتحان پاس کرنے کے بعد 22 سال کی عمر میں انھوں نے گودھرا میں وکالت شروع کی جس کا ضلع صدر دفتر پنچ محل میں تھا۔

قانونی پیشے میں

وٹھل بھائی اپنے خاندانی پیشے زراعات سے پوری طرح جڑے ہوئے نہ تھے۔ لیکن ماحول اور اس کی قدروں نے ان پر بہت اثر ڈالا۔ ایک کسان کا مستقبل کبھی کبھی قدرت کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ جس سے غیر یقینی کیفیت پیدا ہوجاتی ہے۔ وٹھل بھائی کے خاندانی لوگ نئی فصلیں پیدا کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ اچھے بیج اور کھدائی وغیرہ کے مختلف طریقے آزماتے تھے۔ اسی طرح پیداوار کو بیچنے میں بھی بہتر صورت اختیار کرتے تھے۔ اس قسم کے ترقی کرتے ہوئے ماحول نے انھیں حالات کو اچھی طرح سمجھنے اور حقیقتوں پر منحصر سمجھ بوجھ نتیجے نکالنے کے لئے کام کرنا سکھا دیا تھا۔

کسانوں کو مال گزاری کے افسر اکثر پریشان کرتے ہیں۔ اس نے وٹھل بھائی کو کسانوں کی پریشانیوں اور ان کے بے یار و مددگار ہونے کا احساس دلایا۔ ان حالات میں انھوں نے ایسے طریقے سوچے کہ جو ان پریشانیوں کو دور کر سکیں۔

وٹھل بھائی کی شہرت ایک ذہین وکیل کے طور پر پھیل گئی۔ گودھرا میں ان کے پاس بہت سا کام آتا تھا۔ انھوں نے ایک نیا طریقہ اختیار کیا۔ وہ اپنے موکل کے کیس کے اہم نکات کو پوری طرح سمجھ لیتے اور پھر اس کی مخالفت میں جو نکات ہوتے تھے ان کا پوری طرح مطالعہ کرتے تھے۔ اس طرح وہ موثر طریقے سے دلیلیں پیش کرتے تھے۔

وٹھل بھائی نے جلدی ہی اندازہ کرلیا کہ اپنے مستقبل کو بہتر بنانے کے لئے انھیں کسی

بڑے شہر میں کام کرنا چاہیے۔ انہوں نے بورسد کو پسند کیا جو ایک تعلقے کا صدر مقام تھا۔ اس شہر میں وکالت کے لئے بہت اچھے مواقع تھے۔ اس علاقے میں جرائم زیادہ ہوتے تھے۔ اور یہ مقام ان کے خاندانی گاؤں کے بھی قریب تھا۔

بورسد کی وکالت کے زمانے میں وٹھل بھائی کو بالکل فرصت نہ ملتی تھی وہ برابر اپنے گھر اور عدالت کے چکر لگاتے تھے اور عدالت میں تنہائی میں خوب محنت کرتے تھے۔ ان کی محنت کی وجہ سے جلد ہی ان کا کام ان کے قابو میں آگیا۔ قانون کی اچھی سمجھ کی وجہ سے ایک کامیاب وکیل کی حیثیت سے اپنے موکلوں اور ججوں میں وہ بہت مشہور ہوگئے۔

ایک سب جج شکلا کے معاملے نے ان کی حیثیت کو بہت بڑھا دیا۔ شکلا ایک برا آدمی تھا اور اپنی سرکاری پوزیشن سے لوگوں کو پریشان کیا کرتا تھا۔ شکایتوں کے باوجود اس کے خلاف کوئی کارروائی نہیں ہوتی تھی۔ وٹھل بھائی نے یہ معاملہ اپنے ہاتھ میں لیا اور بمبئی ہائی کورٹ کو اس کے لئے تیار کرلیا کہ شکلا کے خلاف کارروائی کی جائے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ شکلا کو نکال دیا گیا۔

1882 میں وٹھل بھائی کی شادی ہوگئی جب ان کی عمر نو سال کی تھی۔ ان کی بیوی دیوالی بائی تھی۔ روایات کے مطابق دلہن کا انتخاب اچھے خاندان سے کیا جاتا تھا۔ اپنی گھریلو ذمہ داریوں کو سنبھالتے ہوئے وٹھل بھائی کی زبردست خواہش تھی کہ وہ آگے تعلیم حاصل کرنے انگلینڈ جائیں۔ وہ جانتے تھے کہ ان کی بیوی ان کے سمندر پار کرنے سے اتفاق نہیں کریں گی۔ کسی دلچسپ بات چیت کے موقعے پر انہوں نے یہ بات واضح کردی کہ اگر ان کی بیوی ان کے ان خیالات سے متفق نہیں ہوتیں جو انہیں بہت عزیز ہیں تو وہ انگلینڈ چلے جائیں گے۔ ان کی بیوی نے کہا کہ اگر وہ جانا چاہتے ہیں تو وہ جاسکتے ہیں، وہ ان کی راہ میں روکاوٹ نہیں بنیں گی۔ انہوں نے محسوس کرلیا تھا کہ وٹھل بھائی یہی چاہتے تھے۔

1905 میں ایک دن انہوں نے کہا کہ وہ ایک کام کے سلسلے میں بمبئی جارہے ہیں۔ انہوں نے ایک اچھی رقم اپنی بیوی کے لئے بھائی کے پاس چھوڑی اور پانی کی جہاز سے لندن تک سفر کیا۔ وہ لنکن ان، ادارے میں پڑھنا چاہتے تھے۔ انہوں نے ڈھائی سال تک وہاں سخت محنت کی اور اول (فرسٹ ڈویژن) میں امتحان پاس کیا۔ اس زمانے میں ولبھ بھائی نے اپنے

خاندان کی دیکھ ریکھ کی۔ 1908 میں ان کی واپسی پر ان کے بھائی ولبھ نے انگلستان جانے کی تیاری کی۔ وہ 1910 میں وہاں گئے اور 1912 میں وہاں سے واپس آئے۔ اس عرصہ میں وٹھل بھائی اپنے بھائی کے بچوں کی دیکھ بھال کرتے رہے۔

انگلینڈ سے واپس آکر وٹھل بھائی نے ایک سال بمبئی ہائی کورٹ کے بمبئی بار کے مانے ہوئے قانون داں اور مشہور وکیل کے ساتھ مل کر کام کیا۔ اس زمانے میں وٹھل بھائی نے نرسن بھائی پٹیل کا کیس اپنے ہاتھ میں لیا۔ انگریزی حکومت نے نرسن بھائی پٹیل کے خلاف کارروائی کی تھی، الزام یہ تھا کہ وہ چھپ کر انقلابی کاموں میں حصہ لیتے ہیں۔ وٹھل بھائی انہیں بری کرانے میں کامیاب ہوگئے۔ وہ ہمیشہ ملزم کی طرف سے پوری طرح محنت کیا کرتے تھے۔

1910 میں وٹھل بھائی کی بیوی کا انتقال ہوگیا۔ ان کی شادی کو 28 سال ہوئے تھے۔ بیوی کے انتقال کے وقت ان کی عمر 37 سال تھی۔ ان کے خاندان کے لوگوں نے انہیں دوسری شادی کے لئے تیار کرنا چاہا لیکن وٹھل بھائی نے یہ طے کرلیا تھا کہ دوسری شادی نہ کریں گے۔ غالباً اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اپنے آپ کو اپنے ہم وطن لوگوں کی خدمت میں پوری طرح لگادینا چاہتے تھے۔ ان کے کوئی اولاد بھی نہ تھی نہ ان کی زندگی کی کوئی دلچسپی تھی۔ انہوں نے ایک بیماری کے بعد اپنی صحت بحال کرنے کیلئے ناڈیاڈ اور آنند میں آرام کیا۔ وہاں انہوں نے یہ محسوس کیا کہ گاؤں والوں کو رہنمائی اور مدد کی ضرورت ہے اور یہ کام کرنا ان کا فرض ہے۔

وٹھل بھائی نے طے کیا کہ انہیں بمبئی علاقے کی قانون ساز کونسل کے لئے الیکشن لڑنا چاہئے۔ یہ الکشن 1912 میں ہوا تھا۔ اس مقصد کے لیے ان کے ایک دوست نے بورسد میں کئی ایکڑ زمین اور کچھ مکان وٹھل بھائی کے نام کردیئے۔ ان کے تعلقات بورسد میں کافی مضبوط ہوگئے تھے اور ان تعلقات کی بدولت وہ مقامی بورڈ اور بعد میں ضلع لوکل بورڈ گجرات کے ممبر بن گئے۔ اس ممبری سے انہیں یہ حق ہوگیا کہ وہ ضلع لوکل بورڈ کی مخصوص سیٹ سے الیکشن لڑ سکیں اور صوبائی قانون ساز کے ممبر بن سکیں۔ وٹھل بھائی اپنی اس کوشش میں بھی

کامیاب رہے۔

وٹھل بھائی نے قانونی پیشہ چھوڑ کر عوام کی خدمت اختیار کرلی۔ ان کی قانون کی ٹریننگ نے ان کے تجربات میں اضافہ کیا تھا اور ان کی صلاحیتوں کو اور تیز کر دیا تھا۔

ایک مقنّن

6 جنوری 1913 کو وٹھل بھائی نے بمبئی کی صوبائی قانون ساز کونسل کے ممبر کی حیثیت سے حلف لیا۔ اس وقت تک قومیت کا احساس اور آزادی حاصل کرنے کی روح جو پورے ملک میں پھیلی ہوئی تھی، اس نے انہیں متاثر کیا۔ اب ان کا مقصد ہندوستان کی آزادی بن چکا تھا۔

وٹھل بھائی نے کونسل میں بہت محنت کی، انہوں نے مسائل کا مطالعہ کیا۔ قاعدے قانون اور طریقہ کار پر عبور حاصل کیا اور کچھ اچھی تجاویز پیش کیں۔ ان کے زبردست علم نے ان کی مدد کی اور اس سے وہ لوگوں کی پریشانیوں کو اچھے انداز میں پیش کرسکے۔ یہ بات ان کے کیے ہوئے سوالوں اور ضمنی سوالوں میں جھلکتی ہے۔ یہی بات ان کے تجویز کردہ نئے قانونوں اور اس وقت موجود قانون کی ترمیموں میں بھی پائی جاتی ہے۔ وہ بمبئی قانون ساز کونسل کی روایات کے ماہر ہوگئے اور انہوں نے برٹش پارلیمنٹ کے طریقہ کار کا مطالعہ کیا۔ وہ قانون سازی کے معاملے میں پوری طرح ماہر ہوگئے۔

وٹھل بھائی کا بنیادی مقصد لوگوں کے حقوق کی حفاظت کرنا تھا۔ قانون ساز کونسل میں ان کے سوالوں کے جواب انہیں آگے سوچنے کے لئے ذہنی غذا مہیا کرتے تھے اور وہ پورے انتظامی معاملات پر سوال تیار کرسکتے تھے۔

1916 میں وٹھل بھائی نے تعلیمی معاملات میں دلچسپی لینی شروع کی۔ تفصیلی مطالعہ کے بعد انہوں نے اندازہ کیا کہ پرائمری تعلیم بہت اہم ہے، لیکن اب تک اس سے لاپروائی برتی گئی ہے۔ آبادی کے زیادہ سے زیادہ حصے کے لئے بنیادی تعلیم مفت ہونی چاہئے۔ انہوں نے میونسپل کمیٹی کی حدود میں مفت اور لازمی تعلیم کی تجویز رکھی، گو کہ لازمی پرائمری تعلیم کو اصولی طور پر تسلیم کیا گیا لیکن اس تجویز کی مخالفت کی گئی۔ وٹھل بھائی نے اس پر اصرار کیا۔

1917 میں انہوں نے بمبئی پریسیڈنسی کے علاقہ میں تعلیم کو بڑھانے کا بل پیش کیا۔ اس بل کا عام طور پر خیر مقدم کیا گیا۔ اس کی تفصیلات مکمل کرنے کے بعد یہ تجویز قانون بن گئی۔ یہ اہم قانون ایک بڑی کامیابی تھی۔

وٹھل بھائی جب قانون ساز کونسل میں تھے تو انہوں نے بہت سی اہم باتیں پیش کیں۔ 1918 کے شروع میں ان کے کونسل کے ساتھیوں نے انہیں دہلی کی قانون ساز امپیریل کاؤنسل کے لئے منتخب کیا۔ 4 ستمبر 1918 کو انہوں نے ممبری کا حلف لیا۔

مرکز میں وٹھل بھائی نے بڑی اہمیت اور شہرت حاصل کی۔ وہ تحمل، محنت، قانون سازی میں مہارت اور پارلیمانی طریق کار کے ماہر مشہور ہوگئے۔ کونسل کے ایک سوال کے جواب میں انہیں بتایا گیا کہ میونیش بورڈوں میں 365 یوروپی اور انگلو انڈن اور چار ہندوستانی تھے۔ اس طرح گورنمنٹ کی ہندوستانیوں کو ملازمت نہ دینے کی پالیسی کھل کر سامنے آگئی۔

انہوں نے جو تجویزیں پیش کیں وہ لوگوں کی واجب شکایتوں اور انتظامیہ کی کمیوں کی طرف عام لوگوں کی توجہ دلانے میں کامیاب رہیں۔ اپنی تجویزوں کے ذریعہ انہوں نے اصولی طور پر قوانین میں ضروری تبدیلیوں کو منوالیا۔

وٹھل بھائی نے مختلف مسائل پر بہت سے حل پیش کیے، جن کا تعلق عوام سے تھا اور وہ عوام کو ہی فائدہ پہونچاتے تھے۔ ان میں سے کچھ نامنظور کردیئے گئے کچھ کو ترمیم کے ساتھ منظور کرلیا گیا۔ ان قوانین نے آزادی کی جدوجہد میں بڑا اہم کردار ادا کیا۔ ان بلوں نے کونسل میں اور اس سے باہر وٹھل بھائی کی شہرت کو چار چاند لگادیے۔ جب فروری 1919 میں رولٹ بل کونسل میں بحث کے لیے پیش کیا گیا تو وٹھل بھائی نے حکومت کو سمجھانے کی کوشش کی کہ اس بل کو ترک کردیں، یا کم سے کم کچھ دن کے لیے ملتوی کردیں۔

انہوں نے حکومت پر شدید اعتراض کیے کہ ترقیاتی کاموں پر، تعلیم پر، صنعت پر اور زراعت پر بہت کم روپیہ خرچ کیا جارہا ہے اور خرچ کا بڑا حصہ دفاع پر ہوتا ہے۔ حکومت نے ان کی باتوں کی پرواہ نہ کی۔ لیکن پانچ لاکھ روپیہ کی ایک رقم عوامی صحت کے لیے مقرر کی گئی۔ سماجی

مسائل وٹھل بھائی کا سب سے بڑا موضوع تھے۔ انہوں نے ان مسائل کے حل ڈھونڈھنے کی کوشش کی۔ ان سخت اور مشکل مسائل کے درمیان بھی وٹھل بھائی نے مزاح کا دامن نہ چھوڑا۔ ایک بار وہ کرم سد واپس آئے۔ جب انہوں نے یہ دیکھا کہ لوگوں نے انہیں نہیں پہچانا تو وہ اپنے والد کے گھر کا راستہ پوچھتے رہے وہاں کے لوگ سوچتے ہی رہے کہ یہ شخص کون ہے اور وٹھل بھائی اس سے مزہ لیتے رہے۔

انگلستان میں

کانگریس نے گورنمنٹ آف انڈیا بل 1919 کے بارے میں اپنی سفارشیں سیلیکٹ کمیٹی کو بھیجیں۔ یہ سفارشات لے کر 12 ممبروں کا ایک وفد انگلستان گیا جس کے ممبر سکریٹری وٹھل بھائی چنے گئے۔ اس بل کے مطابق صوبائی قانون ساز کونسل میں ممبروں کی تعداد بڑھائی جانی تھی اور ان ممبروں کی اکثریت چنے ہوئے لوگوں کی ہونی تھی۔ صوبائی حکومتوں کو اونچے طبقوں کے الکشن کے طریقہ میں زیادہ اختیارات دیئے گئے تھے۔ محکمہ مالیات، قانون اور ضبط ونظم گورنر کے اختیار میں رہے جبکہ تعلیم، صحت عامہ وزیروں کے تحت رہے جو قانون ساز مجلسوں کے سامنے جواب دہ تھے۔

انگلینڈ میں وٹھل بھائی نے دیکھا کہ وہاں کی لوکل کانگریس کمیٹی ہندوستان کی کانگریس کمیٹی کی پالیسی سے مختلف پالیسی پر عمل کر رہی ہے۔ بہت بحث ومباحثہ کے بعد ایک برطانوی کمیٹی کے لیے مفصل دستور وضع کیا گیا جو بعد میں "ہندوستانی قومی کانگریس کی برٹش کمیٹی کہلائی۔" یہ انگلستان میں انڈین نیشنل کانگریس کی اکزیکٹو کمیٹی تھی۔

وفد نے پارلیمنٹ کے بہت سے ممبروں سے ملاقات کی۔ وٹھل بھائی نے کچھ غیر رسمی گروپس اور بڑی تعداد میں ممبروں سے بات چیت کی اور ہندوستانی حالات ان کے سامنے رکھے۔ انہوں نے کمیٹی کے سامنے کانگریس کا نقطہ نظر بھی پیش کیا اور مطالبہ کیا کہ ہندوستان کی حکومت میں ہندوستانیوں کو ملازمتیں دی جائیں۔ انہوں نے اس بات پر زور دیا کہ مرکزی حکومت کے کام میں اصلاح کی جائے اور قانون اور انصاف اور پولس کے علاوہ سب محکمے

صوبوں کی حکومت کو سونپ دیے جائیں۔ گو کہ زیادہ تر اہم سفارشیں منظور نہیں کی گئیں، سوائے ان معمولی باتوں کے جو صوبوں کو سپرد کی گئیں۔ لیکن وہ ڈھ کم سے کم اس بات میں ضرور کامیاب رہا کہ اس نے برٹش عوام کو ہندوستان میں ہونے والے واقعات سے مطلع کر دیا۔

وٹھل بھائی کو اس بات پر یقین تھا کہ گو کہ ہندوستان کی آزادی کے لیے بنیادی جدوجہد اور کوشش ہندوستان ہی میں ہونی چاہیے لیکن اگر ہندوستان کے معاملے میں انگلستان میں بھی کوشش جاری رکھی جائے اور وہاں کے لوگوں کو یہاں کے معاملات صفائی اور تفصیل کے ساتھ بتائے جاتے رہیں تو یہ بھی ہندوستانی جدوجہد میں بہت مددگار بات ثابت ہوگی۔ 1920 میں انگلینڈ واپس آکر وٹھل بھائی نے بہت سے جلسوں میں تقریریں کیں اور جلیان والا باغ کے قتل عام کے سلسلے میں واقعات بیان کیے۔ انھوں نے کہا کہ ہندوستان آزادی کی اپنی قدروں اور جمہوریت کے لیے کوشاں ہے جس کے لئے برٹش دعویٰ کرتے ہیں۔ انھوں نے قانونی اداروں میں اپنے یقین کو بار بار دہرایا۔ وہ الیکشن میں حصہ لے کر اکثریت حاصل کرنے اور حکومت کو شکست دینے میں یقین رکھتے تھے۔

وٹھل بھائی کو گاندھی جی سے اختلاف تھا کہ لوگ اپنے خطاب واپس کریں، اسکولوں اور کالجوں کا بائیکاٹ کریں، انگریزی سامان نہ خریدیں اور قانون ساز مجلسوں سے الگ رہیں۔

وٹھل بھائی نے 1921 میں کونسل کی ممبری سے استعفیٰ دے دیا۔ ان کا یہ عمل انڈین نیشنل کانگریس کی ہدایت کے مطابق تھا۔ حالانکہ انھیں یقین تھا کہ پارلیمانی اداروں کے ذریعہ بہت کچھ حاصل کیا جاسکتا ہے۔ وہ پرامید تھے۔ وٹھل بھائی نے بائیکاٹ کی پالیسی کو کامیاب بنانے میں بہت کوشش کی اور پورے ہندوستان میں کانگریس کے لوگوں کو اسے کامیاب بنانے کے لیے ہدایت کی۔

کارپوریشن میں

مئی 1922 میں انھوں نے ایک پارٹی منظم کی جس کا نام انھوں نے میونسپل نیشنلسٹ پارٹی رکھا۔ چنے جانے کے بعد انھوں نے کانگریس کے کارپوریشن کے ممبروں سے ان کی

ذمہ داریاں اچھی طرح نبھانے کے لیے کہا۔ انہوں نے ممبروں سے کہا کہ وہ اپنی پسند کے محکمے طے کرلیں اور اپنے اپنے علاقے میں مسائل کا تفصیلی مطالعہ کریں۔ انہوں نے بہت سخت زندگی گذاری لیکن اس کا تذکرہ کسی سے نہ کیا۔

انہوں نے ذات پات کے سلسلے میں اپنے کوئی واضح خیالات کا اظہار نہیں کیا۔ ایک بار وہ اپنے دوست کو ساتھ لے کر ایک چائے خانہ میں گئے جہاں عام طور پر گھریلو ملازم اور چھوٹے لوگ جاتے تھے۔ ظاہر ہے اس سے ان کے دوست کو کچھ برا بھی لگا۔ وٹھل بھائی چاہتے تھے کہ عام آدمی کا جو عزت دینے کا روایتی انداز یا معیار ہے اسے جھٹکا دیا جائے۔

وٹھل بھائی نے اسکولی تعلیم کے سلسلہ میں بھی بہت کام کیا۔ 1923 میں وٹھل بھائی اسکول کمیٹی کے چیئرمین چنے گئے۔ انہوں نے اسکولوں کے معائنے کا ایک باقاعدہ سلسلہ شروع کیا اور اس بات کو یقینی بنایا کہ طالب علم اور استادوں کی تعداد میں ایک مناسب تناسب ہونا چاہیے۔ انہوں نے پچھڑے ہوئے لوگوں کے بچوں پر خاص توجہ دی۔ ایک ہی سال میں میونسپل اسکولوں میں پڑھنے والے بچوں کی تعداد دوگنی ہوگئی۔

1924 میں وٹھل بھائی بمبئی کی میونسپل کارپوریشن کے صدر چنے گئے۔ وٹھل بھائی کی عادت تھی کہ وہ پچھلے رکے ہوئے کاغذات کے نکالنے پر زور دیتے تھے، خاص طور پر عام لوگوں کی شکایتوں پر۔ اس سے عام آدمیوں میں کارپوریشن پر اعتماد پیدا ہوا۔ ان کی صدارت کے زمانے میں کارپوریشن کے ممبروں نے اپنی ممبرشپ کو عام آدمی کی خدمت کا ایک موقع سمجھنا شروع کیا۔ وٹھل بھائی نے ثابت کیا کہ ہندوستانی اپنی ذمہ داریوں کو بخوبی نبھا سکتے ہیں۔ یہ ایک بہت قیمتی تجربہ تھا جس نے آگے چل کر اس وقت وٹھل بھائی کی بہت مدد کی جب وہ دلی میں ہندوستانی قانون ساز اسمبلی کے صدر چنے گئے۔

سوراج پارٹی

گاندھی جی کے گرفتار ہونے کے بعد 1922 میں کانگریس نے ایک کمیٹی بنائی تاکہ آئندہ کے لیے پروگرام تیار کیا جائے۔ اس کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ جو کچھ سول نافرمانی کے زمانہ میں

ہوا ہے اس کا جائزہ لیا جائے۔ اس کمیٹی کے ممبر کی حیثیت سے وٹھل بھائی نے بہت دور دور تک سفر کیا۔ انھوں نے اندازہ کیا کہ کانگریس کو کونسل کے الیکشن ضرور لڑنا چاہئیں۔ کونسل کے ممبر ہونے کے بعد ممبروں کے لئے یہ ممکن تھا کہ وہ آزادی کے لیے دباؤ ڈالیں اور حکومت سے ان عملوں کی، جو ہندوستانیوں کے لئے فائدہ مند نہ ہوں، مخالفت کریں۔ اس طرح ان کا یہ عمل حکومت کے ساتھ تعاون نہیں ہوگا۔ انکوائری کمیٹی کی یہ رپورٹ وٹھل بھائی کی ذاتی فتح تھی۔ یہ پرامید خیال اکثر جگہ پسند کیا گیا۔

لیکن کانگریس، اس سے مطمئن نہ تھی۔ اس بے اطمینانی نے کچھ لوگوں کو علیحدہ پارٹی بنانے پر مجبور کیا۔ ان لوگوں میں سی۔ آر۔ داس، وٹھل بھائی پٹیل اور موتی لال نہرو شامل تھے۔ یہ پارٹی 1923 میں بنی اور اس کا نام رکھا گیا "سوراج پارٹی"

سوراج پارٹی کے لوگوں نے پورے ہندوستان میں ایک تحریک چلائی۔ اس زمانہ میں کانگریس نے کونسل میں جانے کے خلاف پروپیگنڈہ بند کر دیا اور پھر ستمبر 1923 میں دہلی کے خصوصی اجلاس نے سوراج پارٹی کے کونسل میں داخل ہونے کے منصوبے کو منظور کرلیا اس طرح سوراج پارٹی کانگریس کا لیجس لیٹیو شعبہ بن گئی۔

ممبری کے پورے عرصہ میں وٹھل بھائی نے سوراج پارٹی کی پالیسی یعنی حکومت کے کام میں متواتر سختی سے اور ہر موقع پر رکاوٹ پیدا کرنے، پر عمل کیا۔ وہ اب سوالات کم کرتے تھے۔ اس کے بدلے وہ تجویزوں اور ترمیموں پر اور بلوں پر کھل کر تقریریں کرتے تھے۔ 1919 کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ میں جو تھوڑی بہت اصلاحات کی گئیں وہ عام لوگوں کی اس مانگ کو پورا نہ کرسکیں کہ انھیں ایک ذمہ دار اور نمائندہ حکومت مل جائے۔

وٹھل بھائی مستقل اور پورے زور کے ساتھ یہ مطالبہ کرتے رہے کہ ہندوستانیوں کو ایک ایسی ذمہ دار حکومت ملنی چاہئے۔ (برٹش حکومت کے ایک حصے کی حیثیت سے) جو ہندوستانیوں کی اور زیادہ اختیارات دینے میں مدد کرے۔ انگریزوں کے آنے سے پہلے ہندوستان دنیا کے دولت مند ترین ملکوں میں سے تھا اور اس کے بعد غریب ترین ہوگیا۔ بہت غور و فکر اور تیاری کے بعد انھوں نے مثالیں پیش کیں کہ کس طرح ہندوستان کی صنعت کو ترقی

دینے کے بہانے انگریزوں نے خود اپنے فائدے حاصل کیے۔

ظاہر ہے سرکاری گروپ اس سے بہت ناراض اور مخالف تھا۔ اگست 1925 میں غیر سرکاری ممبروں کی مدد سے وٹھل بھائی اسمبلی کے ممبر چنے گئے۔ وٹھل بھائی کو غیر معمولی کام اور ان کی ذاتی حیثیت کی وجہ سے مخالف پارٹی کے لیڈر کے روپ میں بہت عزت ملی۔ لوگوں نے سمجھا کہ ان کا انتخاب صحیح ہے کیونکہ وہ پارلیمانی طریقوں سے پوری طرح واقف تھے۔ ان کی روایات، رسوم اور طریقے ان کے لئے نئے نہیں تھے۔

اسپیکر

وٹھل بھائی اسمبلی کے پہلے ہندوستانی اور پہلے غیر سرکاری اسپیکر رہے۔ وٹھل بھائی نے کہا کہ وہ اسمبلی کی کاروائی میں سیاست کو دخل نہ دینے دیں گے اور ہر معاملہ کو اس کی اچھائی اور برائی کے مطابق غیر جانبداری سے حل کریں گے۔ وہ سرکاری لوگوں کو اس بات کی اجازت نہیں دیں گے کہ وہ انھیں یعنی اسپیکر کو ہر بات ماننے پر مجبور کریں۔ وہ کبھی اپنے اعلیٰ معیار سے نہ ہٹے اور ان کے بعد آنے والوں نے بھی ان کی پیروی کی۔ ان کے زیادہ تر فیصلے آج تک روایت کے طور پر احترام کے ساتھ مانے جاتے ہیں۔

1926 میں انتخاب ہونے تھے۔ ابھی انھیں ایک سال بھی نہیں ہوا تھا۔ اس موقع پر وٹھل بھائی نے مضبوطی، غیر جانبداری صفائی قابلیت اور ہمت دکھائی۔ منتخب شدہ ہندوستانی مرکزی قانون ساز کے پہلے صدر کی حیثیت سے ان کی بہت تعریف ہوئی۔

وٹھل بھائی کہتے تھے کہ اس جگہ کو قبول کرنے میں ان کا ایک خاص مقصد تھا۔ وہ برٹش حکومت کو یہ دکھانا چاہتے تھے کہ ہندوستان کے لوگ صرف اس لیے غیر ذمہ دار یا تخریبی تنقید کرتے ہیں کہ انھیں ذمہ داری سونپی ہی نہیں گئی۔ ہندوستان کے لوگوں کو ایک ذمہ دار حکومت چلانے کے لئے تیار کرنے کا طریقہ یہی ہے کہ انھیں حکومت کے کاموں میں شریک کیا جائے۔ اسمبلی کے صدر ہونے کے باوجود وہ آزادی کے ساتھ لوگوں سے ملتے تھے کسانوں، باغ بانوں، مزدوروں سے اور عام آدمیوں سے۔

عالی وقار

جب اسمبلی کا اگلا الیکشن آیا تو وٹھل بھائی نے آزاد امیدوار کی حیثیت سے الیکشن لڑنے کا فیصلہ کیا چونکہ اب سوراج پارٹی بٹ گئی تھی۔ اس کے باوجود اسمبلی نے وٹھل بھائی کو صدر منتخب کیا اور اسے بہترین انتخاب قرار دیا گیا۔ وقار، آن بان، ایک دوسرے کا احترام، خاص طور پر ان حالات میں جب مختلف گروپ زبردست اختلاف رکھتے ہوں، ان سب چیزوں کی ممبروں سے توقع کی جاتی تھی۔ ممبر کا جو بھی سماجی رتبہ ہو اس سے قطع نظر اگر وٹھل بھائی اسمبلی کے جلسہ میں کسی کی طرف سے نامناسب انداز پاتے تھے تو وہ ممبر تک کو ٹوکنے میں نہ ہچکچاتے تھے۔ وہ اس بات کو یقینی بنادیتے تھے کہ وہ ممبر ایوان سے معافی مانگے۔ وٹھل بھائی نے صدارت اور ایوان کے وقار کو پوری طرح نبھایا۔

برطانوی پارلیمانی روایت ہندوستان میں بھی جاری تھی۔ وہ یہ کہ وائسرائے حکومت کے اعلیٰ ترین عہدہ دار کی حیثیت سے قانون ساز اسمبلی کا سالانہ اجلاس شروع کرتے تھے۔ یہ ایک روایت بن گئی تھی کہ قانون ساز اسمبلی کا صدر صدارت کی کرسی وائسرائے کے لئے خالی کر دیتا تھا۔ وٹھل بھائی نے صدر کی حیثیت سے یہ بات زیادہ مناسب اور باوقار سمجھی کہ وہ وائسرائے کا اٹھ کر استقبال کریں اور انہیں ڈائس تک لائیں اور اپنے برابر والی کرسی پر بٹھائیں۔ اس سے سرکاری ممبروں میں سخت ناراضی پھیلی۔ وٹھل بھائی کو یقین تھا کہ صدر کی حیثیت سے ان کا یہ عمل مناسب تھا۔ وائسرائے نے اس طریقہ کار کو قبول کرلیا چنانچہ آج تک یہی طریقہ اختیار کیا جاتا ہے، جب صدر جمہوریہ دونوں ایوانوں کو مخاطب کرنے کے لیے آتے ہیں۔

کتنے ہی ایسے موقع آئے جب وٹھل بھائی کی تقریر جذبات سے بھری ہوئی اور غیر معمولی طور پر شدید ہوجاتی تھی۔ اسے محسوس کرکے وہ صحیح وقت پر بیان دیتے تھے اور اپنی غلطی کو تسلیم کرلیتے تھے۔ اس سے ان کی ہمت اور قابلیت کا اظہار بھی ہوتا ہے اور اس سے وہ لوگوں کی ہمدردی بھی حاصل کرلیتے تھے۔ پارلیمنٹ میں یہ کوشش بھی ہوتی تھی کہ حکومت اپنی طاقت کو دوسروں پر زبردستی تھوپے، جس میں گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ اور اسمبلی کے

اختیارات کو خاطر میں نہیں لایا جاتا تھا۔ وٹھل بھائی بہت احتیاط کے ساتھ حکومت کے اس قسم کے طرز عمل کو جانچتے تھے۔ حکومت کے لوگوں کے لیے وہ کہا کرتے تھے کہ وہ تو اپنا فائدہ دیکھتے ہیں۔ وہ یہ بھی کہتے تھے کہ جو کچھ ہمارے لئے اچھا ہے ضروری نہیں کہ وہ ان کے لئے بھی اچھا ہو۔

فروری 1928 میں سائمن کمیشن ہندوستان آیا جس میں سب انگریز ممبر تھے۔ یہ کمیشن دستوری اصلاحات کے بارے میں مشورہ دینے آیا تھا۔ وٹھل بھائی نے برطانوی لیڈروں سے صفائی سے کہہ دیا کہ ایک کمیشن جو بغیر ہندوستانیوں سے مشورے کیے ہوئے بنایا گیا ہو ہم اس کا استقبال نہیں کرسکتے۔ اور بالکل یہی ہوا بھی۔ وٹھل بھائی اسمبلی کے صدر تھے لیکن وہ ان میٹنگوں میں نہیں آئے۔ چونکہ وہ صدر تھے اس لیے ان کا کہنا تھا کہ وہ تو عوام کے نمائندہ ہیں۔ جس طرح کمیشن بنایا گیا تھا اور جس قسم کے اس کے ممبر تھے وہ ہندوستانیوں کے لئے توہین کی بات تھی۔

وٹھل بھائی یہ بات جانتے تھے کہ برطانوی روایات کے مطابق باہر سے آنے والوں کو پہلے اسمبلی کے صدر کے پاس آنا چاہیئے اور بعد میں صدر کو ان کے پاس جانا چاہیئے۔ آخر میں ہوا یہی کہ کمیشن کے ممبر وٹھل بھائی سے ملنے کے لیے گئے۔ اس طرح وہ اسمبلی کا وقار باقی رکھنے میں کامیاب ہوئے۔

وٹھل بھائی نے اسپیکر کے وقار کو باقی رکھا۔ وہی وقار جو پارلیمانی جمہوریت میں پارلیمنٹ اور انتظامیہ کے درمیانی رشتے میں رکھا جاتا ہے۔ انھوں نے پارلیمانی کاموں کو پوری طرح قاعدوں کے مطابق چلایا۔ انھوں نے اپنے فیصلوں سے رسمیں اور روایات قائم کیں جو اب تک چل رہی ہیں۔ اب تک اس بات کو تسلیم کیا جاتا ہے کہ اسپیکر کے فیصلے اور قاعدوں کی وضاحت کے خلاف آواز نہیں اٹھائی جاسکتی۔ ایوان کی کارروائی سختی کے ساتھ قواعد کے لحاظ سے چلتی تھی۔ اور ایوان کے وقار کو پوری طرح قائم رکھا جاتا تھا۔

صدر نے اس طریقے کی نشان دہی کی کہ ملک کے اہم ادارے یعنی پارلیمنٹ کی کارروائی کو کس طرح جمہوری طریقے سے چلنا چاہیئے۔ انھوں نے پارلیمانی جمہوریت میں پارلیمنٹ

کی اہمیت کو محسوس کیا اور مستقبل میں اس ادارے کی ضرورت کو پیش نظر رکھا کہ صدارت کے وقار اور غیر جانبداری کو سمجھنا اور اس پر عمل کرنا کتنا ضروری ہے۔

گرفتاری

اس عرصے میں ملک میں سیاسی سرگرمیاں تیز ہوگئیں۔ کانگریس کے نسبتاً کم عمر ممبروں میں ڈومینین (کسی دوسرے ملک کے تحت محدود آزادی) درجے کے بدلے مکمل آزادی کا مطالبہ زور پکڑ رہا تھا۔ گاندھی جی نے کانگریس کے لوگوں سے مرکزی اور ریاستی اسمبلیوں سے استعفے دینے کے لیے کہا تاکہ مکمل آزادی کے مطالبے کا دباؤ بڑھایا جائے۔ اس فیصلے نے وٹھل بھائی کے لئے مسئلہ کھڑا کردیا۔ چنے ہوئے صدر کی حیثیت سے ان کا خیال تھا کہ وہ کسی پارٹی کے ممبر نہیں تھے۔ وہ مکمل غیر جانبداری سے کام کرتے تھے۔ اگر وہ 'استعفے' دیتے تو اس کے معنی تھے کہ وہ کانگریس کے راستے پر چلے۔ وہ وقت ان کے لئے کافی سخت تھا جب انہوں نے 'استعفے' نہیں دیا تھا۔ لیکن ان کا خیال تھا کہ یہ ان کا فرض تھا کہ ہندوستانی قانون ساز مجلس کے لئے صحت مند روایت قائم کریں۔

اس وقت ملک بہت پر جوش تھا۔ سردار ولبھ بھائی پٹیل گرفتار ہوئے۔ ان پر مقدمہ نہیں چلایا گیا، بغیر مقدمے کے نظر بند کردیا گیا۔ اس کے بعد گاندھی جی گرفتار ہوئے۔ وٹھل بھائی نے سوچا کہ حکومت ٹکراؤ سے بچنا نہیں چاہتی اس لئے اب وقت آگیا ہے کہ وہ 'استعفے' دے دیں۔ وٹھل بھائی بھی دوسرے قومی رہنماؤں کے ساتھ گرفتار کر لئے گئے۔

جب وٹھل بھائی گرفتار ہوئے تو انہوں نے کہا کہ جب انگلستان میں اسپیکر ریٹائر ہوتا ہے تو اسے خطاب دیا جاتا ہے اور طبقہ امراء میں شامل کیا جاتا ہے۔ لیکن ہندوستان میں یہ عزت افزائی جیل بھیج کر کی جاتی ہے۔

ان کی صحت خراب ہوگئی۔ جب 25 جنوری 1931 کو وہ رہا ہوئے تو انہیں علاج کی سخت ضرورت تھی۔

آر۔ ٹی۔ سی۔

24 فروری کو وٹھل بھائی علاج کے لئے ویانا کے لئے روانہ ہوئے۔ ان کا آپریشن ہوا اور انہیں آرام کا مشورہ دیا گیا۔ جب ہی لندن میں گول میز کانفرنس شروع ہوئی۔ کانگریس کی نمائندگی گاندھی جی کر رہے تھے۔ وٹھل بھائی نے لندن جانے کا فیصلہ کیا تاکہ اگر گاندھی جی کو ان کی ضرورت محسوس ہو تو وہ وہاں موجود ہوں۔ بد قسمتی سے کانفرنس میں بنیادی سوال یعنی آزادی پر بات نہ ہوئی جس پر سب ہندوستانی متفق تھے۔ وہاں اختلافی مسائل زیر بحث آئے۔ کانفرنس بغیر کسی فیصلے کے ختم ہوگئی اور یہ تاثر پیدا ہوا کہ ہندوستانیوں میں آپس میں سخت اختلافات ہیں، اس سے انداز میں اور سختی پیدا ہوگئی۔

جب کانفرنس غیر معینہ مدت کے لئے ختم ہوگئی تو گاندھی جی اور وٹھل بھائی پہلے جہاز سے ہندوستان واپس ہوئے۔ پھر یہ دونوں 1932 میں گرفتار کر لئے گئے۔ جیل میں وٹھل بھائی کی صحت اور گر گئی اور انہیں ہاسپٹل میں منتقل کر دیا گیا۔ 5 مارچ 1932 کو ایک بار پھر وٹھل بھائی علاج کے لئے ویانا کے لئے روانہ ہوئے۔

ویانا میں علاج کے بعد، انہیں آرام کا مشورہ دیا گیا۔ لیکن انہوں نے امریکہ کا ایک تھکا دینے والا دورہ کرنے کا ارادہ کیا۔ وہ نومبر 1932 میں وہاں پہنچے اور اگلے پانچ مہینوں میں مختلف مقامات پر گئے۔ حالانکہ انہیں چلنے کے لیے بھی سہارے کی ضرورت ہوتی تھی لیکن انھوں نے جلسوں میں تقریریں کیں۔ سننے والے ان کی تقریروں سے ہندوستان کے حالات سے واقف اور بہت متاثر ہوئے۔

وٹھل بھائی کا وقت گذرا جا رہا تھا۔ تھوڑے بچے وقت میں زیادہ سے زیادہ حاصل کرنے کے لیے انہوں نے ڈبلن جانے پر اصرار کیا۔ اور 1933 میں وہ وہاں پہنچے۔ وہاں ان کی بات چیت سے آئرلینڈ اور ہندوستان کے درمیان دوستانہ تعلق قائم ہوا۔ وٹھل بھائی کو ہندوستان کے حالات کا علم ہوتا رہتا تھا۔ انہیں یقین ہوگیا کہ عدم تعاون کی تحریک کو ختم نہیں کرنا چاہیئے، لیکن اس مین بنیادی تبدیلی کی ضرورت ہے۔ ان کا خیال تھا کہ اسے اور شدید بنانا چاہیئے، اور

لڑائی مختلف محاذوں پر شروع ہونی چاہیئے۔ ان کی صحت خراب تر ہوتی گئی۔ ہندوستان کا کیس پیش کرنے کے لئے انھیں جنیوا جانے کی دعوت دی گئی۔ ڈاکٹروں نے منع کیا۔ لیکن اس امید پر کہ وہ ہندوستان کے حالات کو لوگوں تک پہنچا سکیں گے اور لوگ ہندوستان کی آزادی کے لئے مددگار بنیں گے وہ جنیوا گئے۔

جنیوا پہنچنے پر ان کی طبیعت زیادہ خراب ہوگئی۔ انھیں ایک ڈاکٹر کے یہاں لے جایا گیا اور آخر 22 اکتوبر 1933 کو وٹھل بھائی چل بسے۔ ہندوستان نے ایک انتھک کام کرنے والا، پریشانیوں کے باوجود آزادی کی جدوجہد میں لگا رہنے والا وطن پرست کھو دیا۔ وہ دوسرے ملکوں کے عوام تک ہندوستان کی آزادی کے مطالبے کو پہنچاتے رہے تھے۔

ان کے لئے زندگی ایک تماشہ تھی۔ ایک کھیل تھی۔ ایک آدمی اسٹیج پر آتا ہے، اپنا پارٹ ادا کرتا ہے اور چلا جاتا ہے، اسے پرواہ نہیں ہوتی کہ اس کے الفاظ اور ایکشن نے کیا اثر چھوڑا۔ وٹھل بھائی کے الفاظ اور کام ان کے اپنی ذات کے لیے نہ تھے بلکہ قوم کو آگے بڑھانے کے لیے تھے اور لوگوں کے ذہن کو وسیع کرنے کے لیے تھے۔

برطانوی پارلیمانی روایت ہندوستان میں بھی جاری تھی۔ وہ یہ کہ وائسرائے حکومت کے اعلیٰ ترین عہدہ دار کی حیثیت سے قانون ساز اسمبلی کا سالانہ اجلاس شروع کرتے تھے۔ یہ ایک روایت بن گئی تھی کہ قانون ساز اسمبلی کا صدر صدارت کی کرسی وائسرائے کے لئے خالی کردیتا تھا۔ وٹھل بھائی نے صدر کی حیثیت سے یہ بات زیادہ مناسب اور باوقار سمجھی کہ وہ وائسرائے کا اٹھ کر استقبال کریں اور انہیں ڈائس تک لائیں اور اپنے برابر والی کرسی پر بٹھائیں۔ اس سے سرکاری ممبروں میں سخت ناراضی پھیلی۔ وٹھل بھائی کو یقین تھا کہ صدر کے حیثیت سے ان کا یہ عمل مناسب تھا۔ وائسرائے نے اس طریقہ کار کو قبول کرلیا چنانچہ آج تک یہی طریقہ اختیار کیا جاتا ہے۔ جب صدر جمہوریہ دونوں ایوانوں کو مخاطب کرنے کے لیے آتے ہیں۔

رفیع احمد قدوائی

ایرا سکسینہ

جن لوگوں نے ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد میں اپنا سب کچھ لگا دیا، اور آزادی ملنے کے بعد اسے کامیاب کرنے میں لگے رہے۔ ان کی فہرست میں رفیع احمد قدوائی کا نام سنہرے حرفوں سے لکھا رہے گا۔

مولانا ابوالکلام آزاد

رفیع احمد قدوائی

زندگی کی ہماہمی سے دور، گرد کے دھند میں گھرا، مسولی، ضلع بارہ بنکی کے بے تاج بادشاہ، رفیع احمد قدوائی کا "محل" کھڑا ہے۔ یہ محل ایک میدان میں کھڑا تھا۔ اینٹوں کا بنا ہوا مکان جس کی کھڑکیوں میں سلاخیں نہ تھیں۔ ایک ٹوٹی پھوٹی چھت کے نیچے اینٹوں کے کھمبوں پر کھڑا ایک برآمدہ تھا۔ اس کی حالت پکار پکار کر مرمت کا مطالبہ کر رہی تھی۔ اصلی گھر کے آگے ایک چھوٹا سا ٹین کا سائبان تھا۔ وہاں کچھ اونچے نیچے ٹیلے تھے۔ آم اور امرود کے کچھ درخت تھے۔ ایک اکیلا لیمپ کا کھمبا، اس بات کی نشانی تھی کہ یہ داخلے کا دروازہ ہے۔ یہ تھا وہ مکمل "شاہی" احاطہ اور بس۔

"یہ..." ان سے قریبی تعلق رکھنے والے گاؤں کے ایک شخص نے کچھ بے یقینی کے ساتھ کہا۔ "قدوائی، جو اپنی دولت ان لوگوں پر نچھاور کر دیتے تھے جو ان سے مدد چاہتے تھے لیکن جہاں تک خود اپنے پر خرچ کرنے کا سوال ہے وہ بہت جزرس تھے۔"

ایک دوست، جو ایک بنک کا ڈائرکٹر تھا لکھنؤ سے جنازے کے ساتھ آخری رسوم میں شرکت کے لیے ساتھ گیا تھا۔ اس نے اپنے گلے کو صاف کیا اور کہا "ان کا انتقال ہوا تو وہ مقروض تھے" یقیناً یہ حیرت انگیز انکشاف تھا۔ "گھبرایئے نہیں۔ ہمیں جیسے ہی ان کے انتقال کی خبر ملی، ڈائرکٹرس کے بورڈ نے متفقہ فیصلہ کیا کہ ان کی طرف بینک کا جو حساب تھا، اسے قلم زد کر کے ختم کر دیا جائے۔ ہر شخص واقف تھا کہ اس نیک شخص نے ایک پیسہ بھی اپنے اوپر خرچ نہیں کیا تھا۔

زبردست مجمع میں بہت سی باتیں لوگوں نے بتائیں۔

"میاں مرحوم نے کتنے بچے چھوڑے۔" کسی شخص نے پوچھا۔

"کہتے ہیں کہ ان کا اپنا کوئی بچہ نہ تھا۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ ان کے اٹھ جانے سے ہزاروں بچے یتیم ہوگئے۔" دوسرے نے جواب دیا۔

کسانوں اور پارلیمنٹ کے لوگوں کا یکساں سرپرست، رفیع احمد قدوائی، مسولی کا "بے تاج بادشاہ" تھا۔ وہ آزادی کی جدوجہد کا سچا سپاہی تھا۔ بہترین منتظم تھا، صحیح معنوں میں قوم پرست تھا۔ جس کا مذہب لوگوں سے محبت کرنا تھا۔

ایک چھوٹے قد کے، سفید کھدر کا کرتا پائجامہ، ایک جُھریاں پڑی، دودھیا رنگ کی اچکن، اور ایک گاندھی ٹوپی، پہنے تیز تیز قدموں سے چلتے گھر سے باہر آتے تھے۔ ان کے ساتھ دوستوں اور ہمنوا لوگوں کی لمبی لائن ہوتی تھی۔ ان لوگوں میں ہلکی پھلکی بات چیت اور ہنسی مذاق بھی چلتا رہتا تھا۔ پورٹیکو کے نیچے وہ رکے۔ دونوں طرف اپنی پسلیوں کو کچھ بے چینی سے پکڑا، بہت تیز کھانسی اٹھی۔ آخر میں دمے کے حملے ان پر بار بار ہونے لگے تھے۔ ڈاکٹر کا مشورہ تھا کہ وہ آرام کریں۔ لیکن اس کی پرواہ نہ کرکے وہ میٹنگوں میں شریک ہوتے تھے اور تنظیمی کام انجام دیتے تھے۔ تبھی ان کے بھانجے مادھو نے ایک کالی بلی کو سڑک پار کرتے دیکھا۔ یہ بات بڑی عجیب تھی، کیوں کہ ان کا خطرناک السیشین کتا ٹائیگر ہمیشہ حفاظت پر رہتا تھا۔

"یہ تو بُرا شگون ہے" مادھو نے اپنے آپ سے کہا۔

"ممی ممی ایک کالی بلی نے ابھی راستہ کاٹا ہے۔" مادھو نے ماں کے کان میں کہا۔ "ماموں سے کہہ دو وہ ابھی نہ جائیں۔"

وہ جانتی تھیں کہ قدوائی ہرگز نہ مانیں گے۔ اگر انہیں پوری بات بتادی تو وہ ضرور جائیں گے لیکن قدوائی نے مادھو کو ماں سے کانا پھوسی کرتے دیکھ لیا۔ انہوں نے بات جاننا چاہی۔

انہوں نے ہمت کرکے کہا "ایک منٹ کے لئے گھر میں آجایئے۔"

انہوں نے بہن کی بات ان سنی کردی۔ پھر مادھو سے مخاطب ہوکر کہا۔ "تم ریڈیو سیٹ

بناتے ہو، سائنس پڑھتے ہو اور اب بھی ان حماقت کی باتوں پر توجہ دیتے ہو۔" اس کے بعد انھوں نے اس لڑکے کو اپنی طرف کھینچ کر لپٹالیا اور آہستہ سے کہا۔

"خوش رہو بیٹے۔ ہم جلد ہی پھر ملیں گے۔"

"یہ میرے گھران کی آخری ملاقات تھی۔" قدوائی کی بہن نے کھادی کی ساری سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

خاندان

تقریباً ساڑھے سات سو برس پہلے مستان شاہ، قاضی قدوا کے خاندان سے ایک عالم تھے۔ انھوں نے ضلع بارہ بنکی میں گاؤں مسولی آباد کیا۔ رفیع احمد قدوائی کے پردادا ظہیرالدین عرف گھرن میاں کو ان کی نیک طبیعت اور نواب اودھ سے عقیدت کی وجہ سے عوام بہت پسند کرتے تھے۔ چھدا میاں، ان کے بھائی جو بہادری کے لیے بہت مشہور تھے، انھوں نے قومی خدمت میں جان دے دی۔ یہ خاندان بارہ بنکی کے قدوائی خاندان کے نام سے مشہور ہوا۔

18 فروری 1894 کی ایک سرد صبح کو قاضی صاحب کے خاندان کے ایک فرد ممتاز علی بےچینی کے ساتھ اپنے پہلے پوتے کی آمد کا انتظار کر رہے تھے۔ ممتاز علی کے بیٹے امتیاز علی کو مسولی کے لوگ پیار میں لالہ میاں کہتے تھے۔ امتیاز علی بھی اپنے بزرگوں کی طرح فراخ دل تھے۔ ان کی بیوی رشیدالنسا بھی ان ہی کی طرح شریف تھیں۔ ان بےچینی کے لمحات میں ممتاز علی نے اپنے ذہن کو بٹانے کی کوشش کی۔ صحن میں غلے کی صفائی کا کام ہو رہا تھا۔ روزمرہ کے کام کی طرح وہ اسے دیکھنے لگے۔ یکایک تھالی بجنے کی آواز نے پریشانی کو ختم کر دیا۔ دائی نے رفیع احمد کی پیدائش کا اعلان کیا۔ ممتاز علی نے اپنے ہاتھ آسمان کی طرف اٹھائے۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا۔ اور دعا کی کہ اس پوتے کو لوگوں کی محبت ملے۔

جوانی

رفیع احمد نے ابتدا ہی سے اپنے بزرگوں کے اثرات کا اظہار کیا۔ وہ شریف بچے اور گھر سے

تھے۔ ان کے بچپن ہی میں ان کی والدہ کا انتقال ہوگیا۔ ان کے والد نے دوسری شادی کی۔ رفیع احمد اپنی سوتیلی ماں کی بہت عزت کرتے تھے۔ اور اپنے بھائیوں شفیع احمد اور محفوظ احمد سے بہت محبت کرتے تھے۔ کبھی کسی نے انھیں غصے میں بھڑکتے نہیں دیکھا۔ یہاں تک کہ کھیل اور کشتی میں بھی انہیں غصہ نہیں آتا تھا۔

دولت مند زمینداروں کے لڑکے آپسی جھگڑوں، کبوتر بازی اور غیر ضروری گپ میں اپنا وقت گذارتے تھے۔ لیکن رفیع احمد اپنے والد کے سخت ڈسپلن میں رہتے تھے۔ انہوں نے اپنے ہم عمر لڑکوں کی عادتیں اختیار نہ کیں۔ وہ دولت مندی کے اظہار کو پسند نہ کرتے تھے۔ وہ سادگی پسند تھے اور پڑھنے لکھنے کے شوقین تھے۔ ایک مشہور پہلوان حاجی چھونک رفیع کے استاد بنائے گئے۔ چھونک بھی ڈسپلن کے معاملے میں بہت سخت تھے۔ ان کی نگرانی کے زمانے میں رفیع نے سادگی اور دوسروں کے ساتھ دوستانہ انداز اختیار کئے۔

ان کے والد سرکاری ملازم تھے اور ان کے زیادہ دن ملازمت کے سلسلے میں دوروں میں گذرتے تھے۔ اس لئے رفیع احمد کو ان کے چچا ولایت علی کے پاس بارہ بنکی بھیج دیا گیا۔ چنانچہ وہ دور جو شخصیت کی تعمیر کا زمانہ ہوتا ہے ان کے چچا کے ساتھ گزرا۔ وہ اپنے چچا سے بھی بہت محبت کرتے تھے۔ ان کے چچا بارہ بنکی کے ایک بڑے وکیل تھے۔ ان کے خیالات اور اصولوں کا رفیع احمد پر بہت اثر پڑا۔ قوم پرستی کے بارے میں ان کے پرجوش انداز نے بھی رفیع احمد کو خوب متاثر کیا۔ اور ان میں انگریزوں کے خلاف جذبہ پیدا ہوگیا۔

رفیع احمد نے 1913 میں بارہ بنکی کے گورنمنٹ ہائی اسکول سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ اور آگے تعلیم حاصل کرنے کی خواہش کی۔

رفیع احمد نے 1914 میں ایم۔ اے۔ او۔ کالج علی گڑھ میں داخلہ لیا۔ اس کالج نے بہت سے قوم پرست لیڈر پیدا کیے۔ ایک قومی کلچر کو فروغ دیا۔ غیر ملکی حکومت کے خلاف جذبہ پیدا کیا اور اپنے ملک سے محبت کا جذبہ پروان چڑھایا۔ کالج کے ماحول نے ان کے دل میں چھپے قومیت کے خیالات کو اور ترقی دی۔ اور جلد ہی انہیں ایک خطرناک انقلابی سمجھا جانے لگا۔ وہ کچھ شرمیلے سے آدمی تھے۔ اس لئے پرجوش تقریریں نہیں کرتے تھے۔

ان کی تنظیمی صلاحیت نے کالج الیکشن کے بارے میں فیصلے لینے میں مدد کی۔ انہوں نے سیاسی تدبیریں سیکھیں اور ان میں ترقی ہوتی رہی۔ کالج کے تجربات نے ان کی سیاسی زندگی میں بہت مدد کی۔ خود کو پیچھے رکھتے ہوئے کام کرنے کا انداز انہوں نے اختیار کیا۔ کالج کے علاقے میں نسبتاً معمولی باغیانہ اختلافات نے ان میں جذبۂ بغاوت کی پرورش کی۔ نیوایرا، اور کامریڈ میں گوپال کرشن گوکھلے اور لوکمانیہ بال گنگادھر تلک کے مضامین نے انہیں تقویت بخشی۔ قدوائی نے جارج برنارڈ شا، جی کے چیسٹرٹن اور ایچ۔ جی۔ ویلس کو بھی بڑی توجہ سے پڑھا۔

قوم پرستی

بال گنگادھر تلک اور اینی بیسنٹ نے ہوم رول کے سلسلے میں جو مطالبہ کیا تھا اس کے ذریعے اپنی خود اختیاری حکومت (سیلف گورنمنٹ) کے مقصود کو واضح کر دیا گیا تھا۔ جنوبی افریقہ میں گاندھی جی نے ستیہ گرہ میں کامیابی حاصل کی تھی اس خبر نے بے چینی کے شعلوں کو اور ہوا دی۔ جب ترکی کے سلطان کو جسے خلیفہ کہا جاتا تھا، تخت سے اتار دیا گیا تو ہندوستان میں تحریک خلافت شروع ہوئی۔ ہندوستان کے مسلمان ترکی کے مستقبل کیلئے بہت پریشان تھے۔ خلافت تحریک کے ذریعے انہوں نے انگریزی حکومت کے خلاف بے اطمینانی اور بے اعتباری کا اظہار کیا۔

دسمبر 1918 میں قدوائی سردیوں کی چھٹی میں بارہ بنکی گئے۔ لکھنؤ میں کانگریس کا ایک بڑا اجلاس ہونے والا تھا۔ مسلم لیگ خلافت کمیٹی کی سفارش پر اس اجلاس میں شریک ہونے والی تھی۔ قدوائی اس امید پر بہت پرجوش تھے کہ وہاں تمام بڑے لیڈروں سے ایک ہی پلیٹ فارم پر ملاقات ہو جائے گی۔

"چچا صاحب! مس بیسنٹ، تلک مہاراج، جناح صاحب، سب وہاں موجود ہوں گے، اس وقت مجھے یہ سنہرا موقع ملے گا کہ میں ان سب کو دیکھوں اور ان کی باتیں سنوں۔ ابا حضور کو اس کے لئے تیار کر دیجیے۔" قدوائی نے کانگریس کے اس اجلاس میں شرکت کے لیے اجازت

کی درخواست کی۔

"نا ممکن" ان کے والد نے جواب دیا۔ جنھوں نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے ایک ایک لفظ سن لیا تھا۔ انہوں نے واضح کرنے کی کوشش کی "کانگریس ایک انقلابی جماعت ہے۔ حکومت کی نظر میں یہ غلط لوگوں کی جماعت ہے۔ اگر حکومت کو پتہ چلا کہ تم اس سے متعلق ہو تو مجھے اپنی نوکری سے ہاتھ دھونے پڑیں گے۔"

قدوائی خاموش ہوگئے۔ والد کے فیصلے کے خلاف کچھ کہنا ان کے خیال میں بے ادبی تھی لیکن وہ خاموشی کے ساتھ اپنے چچا سے بات کرتے رہے۔

"بھائی، یہ نوجوانوں کی خواہش ہے۔ برخوردار اب ماشاء اللہ جوان ہے اور معاملہ کی نزاکت کو سمجھتا ہے۔" اس کے چچا نے اوپری دل سے اس کی وکالت کی۔ "وہ کسی بغاوت وغیرہ میں شامل نہیں ہوگا۔ وہ صرف وہاں جانا چاہتا ہے اور فنکشن کو دیکھنا چاہتا ہے۔"

لالہ میاں کے چہرے پر سنجیدگی کی جھریاں پڑگئیں۔ "ٹھیک ہے اگر تمہارا اصرار ہے تو۔۔۔" انہوں نے مان لیا لیکن نرمی سے کہا "میں اسے الزام نہیں دوں گا اگر اس کے آباؤ اجداد کا خون قومیت کے جھکاؤ میں جوش کھانے لگے۔"

لکھنؤ اجلاس ایک متحدہ اعلان اور آپسی میل جول کے ماحول میں ختم ہوا۔ سیاسی طور پر اس میں بھائی چارے اور اتحاد کے ساتھ ایک ذمہ دار قومی حکومت کی مانگ کی جھلک پائی جاتی تھی۔ قدوائی کا جھکاؤ پہلے ہی سے گوپال کرشن گوکھلے کی سرونٹس آف انڈیا سوسائٹی کی طرف تھا۔ کانگریس کے اجلاس نے انہیں عملی سیاست کی طرف کھینچ لیا۔ بی۔ اے۔ کرنے کے بعد انہوں نے قانون کی تعلیم چھوڑدی اور کانگریس اور خلافت کمیٹی میں شامل ہوگئے۔

1918 میں ان کی بے فکری کو ایک تلخ جھٹکا لگا۔ ان کے چچا کا اچانک انتقال ہوگیا۔ قدوائی نے اپنی چچی اور چچازاد بہن بھائیوں کی دیکھ بھال کی ذمہ داری اپنے سر لے لی۔ اطمینان انہیں صرف اپنی نوجوان بیوی مجید النساء کی شکل میں ملا۔ وہ بھی اپنے شوہر کے آباؤاجداد کے خاندان سے ہی تعلق رکھتی تھیں۔ وہ نرم مزاج تھیں اور انہوں نے بے جھجک ہوکر مسلم خاتون خانہ (گھریلو عورت) کی حیثیت اختیار کرلی۔ اس خاندان میں سادہ رہائش اور تہذیبی

قدروں کو بہت اہمیت دی جاتی تھی۔ انھوں نے اپنے شوہر سے قومیت کے گہرے اثرات اختیار کیے۔ وہ سمجھتی تھیں کہ اپنے شوہر کے پیغام کو پھیلانا ان کا فرض ہے۔ وہ علاقے کی خواتین کے پاس گئیں، انھیں تعلیم دی اور ان سے آزادی اور ستیہ گرہ کی اہمیت بیان کی۔ پھر بھی گھریلو ذمے داریوں کو پورا کرنا انھیں عوامی زندگی سے زیادہ اچھا لگتا تھا، چونکہ اس کے ساتھ انھیں اپنے مذہبی فرائض کو پورا کرنے کا بھی تھوڑا بہت وقت مل جاتا تھا۔

منظر عام پر

1919 کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ میں کچھ بہت بڑی تبدیلیاں پیدا کی گئی تھیں۔ اس سے ایک دوہری حکومت (ڈایار کی) کی تشکیل ہوئی تھی جس میں کچھ محکمے یا شعبے (سبجیکٹس)۔ جیسے مالیات، نظم وقانون، براہ راست حکومت کے ہاتھ میں رزرو رہتے تھے، اور باقی محکمے۔ تعلیم، صحت عامہ اور مقامی حکومتیں (لوکل سیلف گورنمنٹ) ان وزیروں کو سونپے جانے تھے جنھیں عوام چن کر بھیجتی ہے۔ ظاہر ہے یہ نظام لوگوں کی اس مانگ کو کسی طرح پورا نہیں کررہا تھا جو انھوں نے سیلف گورنمنٹ (خود اختیاری حکومت) کے روپ میں پیش کی تھی۔

اور اس کے ساتھ ہی ساتھ رولیٹ ایکٹ بھی نافذ کیا گیا جس کے ذریعے حکومت کو اختیار تھا کہ وہ جسے چاہے گرفتار کرے اور کسی عدالت میں مقدمہ چلائے بغیر جیل میں بند کردے۔ اس ایکٹ کے ذریعے حکومت عوام کی بے اطمینانی اور احتجاجی تحریکوں کو سختی سے کچل سکتی تھی۔

بے چینی اور گھبراہٹ کی ایک لہر ہندوستان میں دوڑ گئی۔ احتجاج کے طور پر گاندھی جی نے عدم تشدد کی بنیاد پر عدم تعاون کی تحریک شروع کی۔ گاندھی جی کی رہنمائی میں رولیٹ ایکٹ کے فوراً بعد جلیان والے باغ کا بھیانک قتل عام 13 اپریل 1919 کو ہوا۔ یہ حادثہ میخائل اوڈائیر کی گورنری میں ہوا تھا۔ سیکڑوں نہتے لوگوں کو گولیوں سے بھون دیا گیا یا زخمی کردیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی کانگریس قوم پرستی کی ایک نشانی یا علامت بن گئی اور ملک کی

آزادی حاصل کرنے کا ایک وسیلہ سمجھی جانے لگی۔

اس سے پہلے نہ کبھی اتنے وسیع پیمانے پر عوامی احتجاج ہوا تھا اور نہ کبھی اتنی بے دردی اور بے رحمی سے اسے کچلا گیا تھا۔ حکومت سے عوام کی بے زاری اور ناراضگی کا اظہار سب سے زیادہ غیر ملکی چیزوں کے بائیکاٹ میں نظر آیا۔

اس موقع پر قدوائی کھل کر سامنے آگئے اور انھوں نے غیر ملکی کپڑے کے بائیکاٹ کے لیے رضا کار تیار کیے۔ انھوں نے لوگوں میں سیاسی شعور ابھارنے اور سیاست اور عام زندگی میں عدم تشدد کے پرچار کا کام سنبھالا۔ ان کا پختہ یقین تھا کہ ہندو اور مسلمان جو صدیوں سے ساتھ رہے ہیں، اور ان کی ان گنت نسلوں نے ملک کی تاریخ میں ساتھ ساتھ حصہ لیا ہے، انھیں آئندہ بھی ساتھ ہی رہنا ہے اور اس لیے یہ ان کا اخلاقی فرض ہے کہ وہ ان طاقتوں کو ناکام بنائیں جو اس برادری اور ایکتا کو تباہ کرنے کی درپے ہیں۔ اور جب دونوں کا مقصد آزادی حاصل کرنا ہوگا تو یہ اتحاد بھی لازمی طور پر حاصل کرنا ہوگا۔ چنانچہ یہ فرقہ وارانہ اتحاد اور میل جول کے پیغام کو پھیلانے کے لیے گاؤں گاؤں پیدل پھرے۔ انھوں نے جلسے کیے، احتجاجی مظاہرے منظم کیے مگر جہاں تک ممکن ہوسکا عام پبلک میں تقریر کرنے سے گریز کیا۔

1921 کے آخری حصے میں جب احمد آباد میں کانگریس کے اجلاس کی ایک قرارداد کے ساتھ آزادی کی جدوجہد کو آگے بڑھانے کے سلسلے میں گاندھی جی کو مکمل اختیارات سونپ دیے گئے تو ملک کے عوام ایک بار پھر عدم تشدد کی بنیادوں پر حکومت سے عدم تعاون کی تحریک میں لگ گئے۔

1922 میں قدوائی اپنے بھائی شفیع احمد کے ساتھ گرفتار ہوئے، شفیع احمد نے قومی جدوجہد میں حصہ لینے کے لئے اپنی ملازمت سے استعفی دیا تھا۔ اس موقع پر قدوائی کو قید سخت بامشقت کی سزا ہوئی۔ انھیں سیکڑوں دوسرے رہنماؤں کے ساتھ جیل میں ڈال دیا گیا۔ لکھنؤ جیل میں جواہر لال اور موتی لال نہرو سے ان کے تعلقات بنے۔ ان دونوں کی قدوائی ہمیشہ بہت عزت اور قدر کرتے تھے۔

5 فروری 1922 کو چوری چورا (گورکھ پور، اتر پردیش) کے مقام پر ایک بھیانک حادثہ ہوا۔ یہاں کچھ قوم پرست، جو اب تک عدم تشدد پر عمل کر رہے تھے، ایک دم تشدد پر اتر آئے اور انھوں نے پولس کے ان سپاہیوں پر بڑی بے دردی سے حملہ کر دیا جو ان پر گولی چلا رہے تھے۔

گاندھی جی کو اس خبر سے بہت تکلیف پہنچی۔ اور انھوں نے عدم تعاون کی تحریک واپس لینے کا فیصلہ کر لیا۔ بہت سے کانگریس کارکنوں نے گاندھی جی کے فیصلے کی مخالفت کی۔ اور اپنا احتجاج جاری رکھا۔

دسمبر 1922 میں موتی لال نہرو اور چترنجن داس نے سوراج پارٹی شروع کی۔ ان کا خیال تھا کہ سیاسی بے اطمینانی کو ہوا دیتے رہنا قومی تحریک کو باقی رکھنے کا صحیح ذریعہ ہے۔ سوراج پارٹی کی پالیسی بنیادی طور پر بائیکاٹ پروگرام اور پارلیمنٹ میں انگریزوں کی مخالفت کرنا تھی۔

قدوائی سے موتی لال بہت متاثر تھے۔ انھوں نے 1925 میں یو۔پی۔ کانگریس کے جنرل سکریٹریوں کے انتخاب میں قدوائی کو ایک جنرل سکریٹری چنوایا۔ اسی سال چترنجن داس کا انتقال ہو گیا۔ موتی لال نے قدوائی کو ان کی آخری رسوم میں شرکت کے لیے الہ آباد بھیجا۔

موتی لال نہرو نے قدوائی کو اپنا پرائیوٹ سکریٹری بنا لیا۔ انھوں نے سوراج پارٹی کے کام کو آگے بڑھایا۔۔۔ یعنی قانون ساز اسمبلی میں داخلہ۔۔۔ جس کا مقصد رائے عامہ کو اسمبلی میں پوری قوت سے اٹھانا تھا۔ اپنے صاف ذہن اور خلوص کی وجہ سے، قدوائی نے جلد ہی الیکشن کے طریقوں پر قابو حاصل کر لیا۔ اس میدان میں بھی ان کی ذہانت کی بہت تعریف کی گئی۔

جیسے جیسے قدوائی کا سیاسی روپ آگے بڑھا ویسے ویسے ان کے خاندان پر انگریزوں کا غصہ بڑھتا گیا۔ ان کے گھروں کی تلاشی تقریباً روز کا دستور بن گئی۔ اور ان پر بہت جرمانے عاید کئے گئے۔ للا میاں کی بے داغ کارکردگی کے باوجود ان سے سختی کے ساتھ جواب طلب کئے جانے لگے اور ان کی دیانت داری پر شبہ کیا جانے لگا۔ رفیع صاحب کے چھوٹے بھائی شفیع احمد کوآپریٹیو سوسائٹی کے نائب رجسٹرار تھے۔ جب سے گاندھی جی کی عام اپیل پر انھوں

نے اپنے عہدے سے استعفیٰ دیا تھا، انگریزی حکومت ان کے والد پر دباؤ ڈالتی تھی کہ وہ اپنے بیٹوں کے کاموں پر کنٹرول کریں۔

للا میاں نے مضبوطی کے ساتھ جواب دیا "نہیں میں اپنے بیٹوں کی زندگی کے طریقوں میں دخل نہیں دوں گا۔"

جب سے رفیع نے یہ سنا تو وہ اور جذباتی ہو گئے اور اپنے والد کی اجازت کو خاموشی کے ساتھ قبول کیا۔ الیکشن کی تیاری میں ڈوب گئے۔

1925 میں یکایک وہ دوسرے حادثے سے دوچار ہوئے۔ ان کا سات سال کا لڑکا مرگیا۔ اس اکلوتے بچے کی موت نے قدوائی اور ان کی بیوی کو توڑ کر رکھ دیا۔ مجید النسا کو صبر نہیں آرہا تھا۔ ان کی پوری زندگی تو اپنے شوہر اور بچے کے گرد ہی گھومتی تھی۔ اور چونکہ قدوائی زیادہ تر سیاسی کاموں میں الجھے رہتے تھے اس لیے اب ان کی توجہ کا مرکز صرف ان کا اکلوتا بچہ رہ گیا تھا۔ قدوائی بھی یہ سب کچھ سمجھتے تھے۔ حالانکہ ان کا دل خون کے آنسو روتا رہا لیکن وہ صبر و سکون سے خاموش رہے اور اپنی بیوی کی دلدہی کی کوشش کرتے رہے۔ مگر ان کی بیوی کو صبر نہیں آرہا تھا۔ قدوائی نے خاموشی میں اور ان کی بیوی نے خود کو سخت عبادت میں گم کرنے کی کوشش کی۔ آخر قدوائی کی بیوی نے حج کے لئے مکہ جانے کی خواہش کی۔ انھوں نے ان کے سفر اور حج وغیرہ کے سارے انتظامات مکمل کر دیئے۔ اور جب وہ حج کے لیے چلی گئیں تو وہ اپنے غم پر قابو پانے کے لئے پوری طرح کام میں لگ گئے۔

مرکزی قانون ساز

1926 میں مرکزی قانون ساز اسمبلی کے لئے الیکشن ہوئے۔ تمام رکاوٹوں کے باوجود سوراج پارٹی نے 38 جگہیں جیتیں۔ قدوائی اودھ سے چنے گئے۔ انھیں سوراج پارٹی کا چیف مقرر کیا گیا۔ ان کی زبردست سیاسی سوجھ بوجھ اور انسانی رشتوں کو مضبوط رکھنے کی صلاحیت کی وجہ سے کئی اختلافی مسئلوں کے باوجود پارٹی متحد رہی۔ 1929 میں وہ اسمبلی میں سوراج پارٹی کے سکریٹری مقرر ہوئے۔ اس پورے عرصے میں موتی لال نہرو سے ان کی

وفاداری پوری طرح قائم رہی۔

اس دوران ہندو مسلم جھگڑے نے ملک میں خطرناک شکل اختیار کرلی تھی۔ یہاں تک کہ اسمبلی میں بھی ممبر مذہب کی بنیاد پر بٹ گئے تھے۔ قدوائی نے پارٹی کی تجویز کی ہوئی ترمیموں کی موافقت میں ہندو اور مسلم دونوں فریقوں کے ممبروں کی مدد حاصل کرنے کی کوشش کی۔ 1928 کے معاشی بل (فائنانس بل) میں نمک پر ٹیکس لگانے کی تجویز آئی۔ قدوائی نے محسوس کیا کہ یہ غریبوں کے لئے پریشان کن ہوگا۔ انہوں نے ممبروں پر خوب اثر ڈالا اور آخر بل کو نامنظور کرانے میں کامیاب ہوئے۔

1930 میں نمک کے قانون ایک بڑا سیاسی مسئلہ بن گئے۔ اس سے آزادی کی تحریک کو بہت مدد ملی۔ گاندھی جی نے سول نافرمانی کی تحریک کا اعلان کیا۔ کانگریس نے مکمل آزادی کی اپیل جاری کی۔ قدوائی نے جنوری 1930 میں کانگریس ورکنگ کمیٹی کی تجویز پر مرکزی اسمبلی سے استعفیٰ دے دیا اور تحریک میں شریک ہوگئے۔

قدوائی کا خیال تھا کہ اسمبلی میں رہتے ہوئے بھی انگریزوں کا بااثر طریقے سے مقابلہ کیا جاسکتا ہے۔ انہوں نے سوچا۔ "برطانیہ مخالف پروپیگنڈے کو تیز کرنے میں اسمبلی بہت مددگار ثابت ہوسکتی ہے چونکہ لیجسلیچر کے ممبروں کو کچھ مخصوص حقوق اور تحفظ دیے جاتے ہیں۔"

قدوائی سول نافرمانی کی تحریک کو بھی دیہات تک لے گئے۔ یہاں انہوں نے اسے "لگان نہیں" کی شکل دی۔ اپنے دورے کے دوران انہوں نے غریب کسانوں کی حالت کو دیکھا۔ گو کہ لگان کے خلاف تحریک زمین داروں کے مفاد کے خلاف تھی، لیکن انھیں یقین تھا کہ اس سے کسانوں کی پریشانیاں کچھ کم ہوں گی۔ کسان بہت پریشان تھے کہ انہیں بہت سا لگان دینا پڑتا تھا لیکن پیداوار کی قیمت کم ملتی تھی۔ انہوں نے قدوائی کی تحریک کی مدد کی۔

ایک بار پھر قدوائی نے ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں کا سفر کیا۔ وہ جہاں جاتے رضاکاروں کے جتھے منظم کرتے، ساتھ ہی ساتھ عدم تشدد اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور اتحاد کی بھی تلقین کرتے جاتے تھے۔ قدوائی اب اپنے دوستوں اور عام لوگوں کے لئے رفیع صاحب

بن گئے تھے۔

قدوائی کے لئے گرفتاری کا وارنٹ جاری ہوا۔ لیکن پولیس انہیں پہچانتی نہ تھی۔ ان پچھلے برسوں میں وہ کیمرے کی آنکھ سے بچتے رہے تھے۔ اور پہچانے نہ جانے میں خود کو محفوظ پاکر وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتے رہے اور جلسے کرتے رہے۔ جون 1930 میں جب وہ گرفتار ہوئے تو تحریک ضلع بھر میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل چکی تھی۔ انہیں قید کی سزا ہوئی۔

رائے بریلی جیل میں قدوائی صاحب نے قیدیوں کی بدحالی پر احتجاج کیا۔ جب انہیں رسی بٹنے کا کام دیا گیا تو انہوں نے اس سے انکار کر دیا۔ لکھنؤ ڈویژن کا انگریز کمشنر والٹون، اس مسئلے کو سننے کے لئے آیا۔ اس نے قدوائی صاحب کو مارنے کے لئے چھڑی اٹھائی۔ غصے میں بپھرے قدوائی نے ہاتھ بڑھا کر چھڑی چھین لی اور اس کے دو ٹکڑے کر دی۔ دوسرے دن انہیں قید تنہائی میں بھیج دیا گیا۔

اپنی قید کے زمانے میں انہوں نے تحریک کی رہنمائی اور مجاہدین آزادی کے خاندانوں کی معاشی امداد میں خود کو مصروف رکھا۔ جیسے ہی انہیں پتہ چلتا کہ کسی شخص کو بہت ضرورت ہے تو وہ فوراً اس کی مدد کے لئے راستے تلاش کرتے تھے۔ ذاتی بھی اور کانگریس فنڈ سے بھی۔

اگست 1934 میں اتفاق سے قدوائی صاحب کی رہائی اور موتی لال نہرو کا انتقال ساتھ ساتھ ہوا اور اسی زمانے میں گنیش شنکر ودیارتھی کانپور میں فرقہ وارانہ فساد کا شکار ہوئے۔ ان دل ہلا دینے والے غمناک واقعات نے انہیں زبردست صدمہ پہنچایا۔ پھر بھی انہوں نے جواہر لال نہرو کے ساتھ کام کرنے کی زبردست ذمہ داری قبول کرلی۔

لمبی قید نے قدوائی صاحب کی صحت خراب کردی تھی۔ انہیں دل کا دورہ پڑا لیکن انہوں نے کام کی رفتار کم نہ کی۔

1935 میں گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ پاس ہوا۔ ایکٹ کے مطابق صوبوں میں کسی قدر خود اختیاری حقوق ملنے سے عوامی حکومتیں، قائم ہوئی تھیں۔ ایکٹ سے عوام مطمئن نہ ہوئے۔ اس عدم اطمینان کی وجہ یہ تھی کہ سیاسی اور معاشی دونوں اختیار انگریزی حکومت نے

اپنے ہاتھ میں رکھے تھے۔ کانگریس نے اس ایکٹ کو مکمل غیر اطمینان بخش قرار دے کر رد کر دیا، لیکن قانون ساز اسمبلی میں حصہ لینے کا فیصلہ کیا۔

منتظم

فروری 1937 کے الیکشن میں کانگریس کو بہت سے صوبوں میں فتح ہوئی اور اس کے نمائندے بھاری اکثریت سے کامیاب ہوئے۔ یوپی میں پنڈت گووند بلبھ پنت وزیر اعلیٰ بنے اور قدوائی کو وزیر بنایا گیا۔ انہیں مالیات اور جیل کے محکمے دیے گئے۔

حکومت بنانے کے بعد کانگریس کو جن مسائل کا سامنا تھا ان میں زمینداری کا معاملہ بہت پرانا اور سخت تھا۔ یہ ذمہ داری قدوائی کے سر پڑی۔ انہوں نے دیہات کے دوروں کے زمانے میں اس مسئلے کو سمجھا تھا۔ انہوں نے تجویز کیا کہ ایک مدت سے چلا آرہا کسانوں اور زمینداروں کے بیچ کا فاصلہ کم کیا جائے۔ اور کسانوں اور زمینداروں کو برابر کا درجہ حاصل ہو۔ ان اصلاحات سے بیگار (زبردستی بغیر اجرت کی مزدوری) کی بری رسم ختم ہوگئی۔ اور زمیندار کو پیش کیا جانے والا نذرانہ (تحفہ) بھی ختم ہوگیا۔ ان تبدیلیوں سے غریبوں پر خوشگوار اثر پڑا۔ اور قدوائی نے ان کے دل جیت لیے۔

گورکھپور کے سرکاری دورے کے موقع پر قدوائی نے دیکھا کہ مقامی انگریز مجسٹریٹ ان کے استقبال کے لیے نہیں آیا۔ یہ غیر حاضری سوچی سمجھی تھی۔ قدوائی نے اسے سبق سکھانے کا فیصلہ کیا۔ پورے دورے کے دوران انہوں نے اس خودسر انگریز کا کوئی ذکر نہ کیا۔ جیسے ہی دورے سے واپس پہنچے، انہوں نے انگریز مجسٹریٹ کا اپنے سکریٹریٹ میں تبادلہ کرالیا۔ اب اس کے پاس بچنے کا کوئی راستہ نہ تھا۔ اب اسے اپنے منسٹر کی تعظیم کرنی ہی تھی۔

ایک دن قدوائی نے اپنے سکریٹری سے رائے بریلی کے جیلر کو بلانے کے لیے کہا۔ جب دونوں کی آنکھیں ملیں تو منسٹر کو یاد آگیا کہ یہ وہی جیلر ہے جس نے قید کے زمانے میں انہیں اذیتیں دی تھیں۔ جیلر نے بھی انہیں پہچان لیا۔

"سر۔۔ سر" وہ بوکھلاکر ہکلایا۔ وہ اپنے کو خطاوار محسوس کررہا تھا۔

قدوائی نے سمجھ لیا۔ انہوں نے پریشان آفیسر کو پرسکون کیا۔ "تم اس وقت اپنا فرض نبھارہے تھے۔ پریشان نہ ہو۔ میں نے تمہیں اس لیے نہیں بلایا ہے کہ تم سے بدلا لوں۔" اپنی خوش اخلاقی سے انہوں نے جیلر کا دل جیت لیا اور وہ ان کا احترام کرنے لگا۔

جیسے جیسے قدوائی کی فیاضی کا لوگوں کو پتہ چلتا گیا ان کی ہردل عزیزی میں اضافہ ہوتا گیا۔ کچھ مسلم لیگی قسم کے مسلمان ان کے غیر مذہبی (سیکولر) خیالات کی وجہ سے ان سے ناراض بھی تھے۔ "ہندوستان چھوڑو" تحریک کے زمانے میں مسلم لیگ نے انہیں اسلام دشمن، اور غدار، بھی قرار دیا تھا۔ لیگ نے اس تحریک میں حصہ نہیں لیا تھا اور ایک الگ ریاست کے قیام کے لئے زور دیتی رہی تھی۔ جب آزادی ملنے کا زمانہ قریب آیا تو ملک تقسیم کی طرف بڑھتا گیا۔

ہندو اور مسلمان ایک دوسرے سے دور ہوتے گئے ۔ اس سے قدوائی ذہنی طور پر بہت پریشان تھے ۔ ہر عام جلسے میں وہ فرقہ واریت کے خلاف اعلان کرتے تھے۔ اور "جیو اور جینے دو" اور آپسی دوستی کی وکالت کرتے تھی۔ فرقہ وارانہ نفرتیں تقسیم کے بعد بھی ختم نہ ہوئیں۔ اور بھیانک فسادات نے قانون اور سماج کو درہم برہم کردیا۔

یوپی کے وزیر داخلہ کی حیثیت سے قدوائی یک جہتی کو قائم رکھنا اپنا اخلاقی فرض سمجھتے تھے ۔ انہوں نے لیڈروں سے بھائی چارہ اور یکجہتی قائم رکھنے کے لیے کوشش کرنے کی اپیل کی۔ انہوں نے فسادزدہ علاقوں کے دورے کیے۔ فساد سے متاثر لوگوں کی بلاتفریق مذہب پوری پوری امداد کی۔

مرکزی کابینہ میں

اس زمانے میں قدوائی کے کچھ مخالفوں نے جو ان کی ہردلعزیزی سے ناخوش تھے، ان کے خلاف کانا پھوسی کی مہم شروع کی۔ انہوں نے ان کی نیت پر شبہ کیا اور یہ بتانے کی کوشش کی کہ کسی مسلمان پر بھروسہ نہیں کیا جاسکتا۔ نہرو ان حالات کو سمجھ گئے ۔چنانچہ

انھوں نے اگست 1947 میں انھیں مرکزی کابینہ میں رسل ورسائل (کمیونیکیشن منسٹر) کی حیثیت میں شامل کرلیا۔

اکتوبر 1947 میں قدوائی ایک میٹنگ سے واپس آتے تو ان کا سکریٹری تیزی سے ان کے پاس آیا اور ان کے کان میں کہا۔ "جناب! ایک بہت ہی بری خبر۔۔۔ شفیع کو چاقو مار کر ہلاک کردیا گیا۔"

"او۔ نہیں۔ نہیں۔" قدوائی کی ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ انھوں نے اپنی پریشانی کو چھپانے کی کوشش کی۔۔۔ شفیع ان کا اپنا بھائی، جس نے ہمیشہ یک جہتی کے فلسفے کی تعلیم دی۔ جس نے سیکولر خیالات اپنے بزرگوں سے سیکھے اور اپنائے، اور ان پر اپنی زندگی اور سیاست میں عمل کیا، وہ اس بے دردی سے فرقہ پرستی کی قربان گاہ کی بھینٹ چڑھا دیا گیا۔ یہ قابل یقین بات نہ تھی۔ چند لمحے وہ ساکت کھڑے رہے اور آہستہ سے کہا "اناللہ۔" جلد ہی انھوں نے اپنے اوپر قابو پالیا۔ اور گھر میں چلے گئے۔

وہ دہرہ دون کے لیے روانہ ہوئے۔ پورے سفر میں قدوائی خاموش بیٹھے رہے۔ اپنے اندر مردہ بھائی کو دیکھنے کی ہمت پیدا کرتے رہے۔

کافی لوگ منسٹر کا انتظار کررہے تھے۔ قدوائی سیدھے بھائی کی لاش پر گئے۔ بھائی کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں لیا۔ ان کے ماتھے کو پیار کیا۔ اور پھر تھوڑی سی دیر کھڑے رہے اور بس اگلے ہی لمحے وہ وہاں سے ہٹ گئے۔ اور جلد از جلد انھیں دفن کرنے کی ہدایت کی۔

سادہ رسم کی ادائیگی کے بعد قدوائی نے قبر کو مٹی دی۔ شاید فرقہ پرستی سے انھوں نے اس وقت سے زیادہ کبھی نفرت نہیں کی ہوگی۔ ہمیشہ کی طرح بالکل غیر جذباتی انداز میں انھوں نے ان سیاسی لوگوں کے خلاف بات کی جو تقسیم کے بعد بھی سوسائٹی میں دراڑیں پیدا کرنے کی کوشش کررہے ہیں۔

آزادی کے بعد قدوائی کو قانون ساز اسمبلی کا ممبر نامزد کیا گیا۔ رسل ورسائل کے وزیر کی حیثیت سے وہ خود کفیل ملک کی تعمیر کے حصہ دار بنے۔ صنعتی اداروں کی طرف سے ٹیلیفون کی زبردست مانگ تھی۔ وزارت اس وقت اتنی مانگ کو پورا کرنے کی حالت میں نہ تھی۔ ٹیلیفون

کے آلوں کی ضرورت تھی۔ ان کے لئے لائنیں ڈالنی تھیں۔ ان چیزوں کے لیے بڑے وسائل کی ضرورت تھی۔

رفیع احمد قدوائی نے "اپنی ملکیت کے ٹیلیفون لگواؤ" ۔۔۔ کی اسکیم شروع کی۔ کچھ روپئے پیشگی جمع کرنے پر ٹیلیفون لگوایا جاسکتا تھا۔ بہت حد تک یہ اسکیم ضرورت پوری کرنے میں کامیاب رہی۔ انہوں نے رات کی ہوائی ڈاک کا سلسلہ شروع کیا اور ڈاک وتار کے ملازمین کے لئے اتوار کی چھٹی بھی شروع کی۔ انہوں نے نئی نئی راہیں نکالنے کے خیالات دیئے۔

سب کے دوست

جب قدوائی شہر میں ہوتے تھے تو وزیر کی رہائش گاہ پر ملاقاتیوں کا ایک کبھی نہ ختم ہونے والا تانتا لگا رہتا تھا۔ ہر آدمی، ہر وقت ان تک پہنچ سکتا تھا۔ چاہے وہ ایک طالب علم ہو جو اپنی تعلیم کا خرچ نہیں اٹھا سکتا، چاہے کوئی نوجوان ملازمت کی تلاش میں ہو، چاہے کوئی فکرمند ماں باپ اپنی بیٹی کے لئے مناسب لڑکے کی تلاش میں ہوں۔ سب ان کے پاس سے مطمئن لوٹتے تھے۔ وہ لوگوں کی مالی مدد بھی کرتے تھے اور کیا ہوا وعدہ ہمیشہ نبھاتے تھے۔

قدوائی اپنے دوستوں سے پیار کرتے تھے۔ ان کے اچھے دوستوں کا ایک گروپ تھا جو رات گئے تک ان کے ساتھ وقت گذارتا تھا۔ یہ لوگ پیار میں "مرفین" کہلاتے تھے۔ ان کی بیماری کے زمانے میں بھی قدوائی کی محفل مکان میں بھرپور زندگی رکھتی تھی۔ وہ اپنے دوستوں کو بہترین تحفوں سے نوازنے کے شوقین تھے۔ ایک بار انہوں نے بستر کے قریب کی میز سے کچھ قلم لے کر بستر پر پھیلا دیئے۔ مشہور شاعر اور پارلیمنٹ کے ممبر بال کرشن شرما نوین، سے کہا کہ ان میں سے اپنی پسند کا ایک لے لو۔ جیسے ہی نوین نے ہاتھ بڑھایا قدوائی نے قلم اٹھالیا۔ نوین نے اسے خلاف معمول پایا۔

"اس قلم میں ایسی کیا خاص بات ہے۔" انہوں نے پوچھا۔ قدوائی نے جواب دیا "بہت ہی خاص۔ میں اس قلم کو اپنے سے الگ نہیں کرسکتا۔" قدوائی نے جواب دیا۔ "یہ شفیع

کا قلم ہے۔" اور انہوں نے وہ قلم اپنی اچکن کی اندر کی جیب میں دل کے قریب رکھ لیا۔

ایک بار حصار سے ایک صاحب قدوائی صاحب کے پاس تشریف لائے۔ اپنی پریشانیوں کا حال بیان کرتے ہوئے انہوں نے اپنی بیٹی کی شادی کے لئے رقم کا مطالبہ کیا۔ فوراً ہی انہوں نے انھیں ایک چک دے دیا۔ جب وہ شخص چلا گیا تو ان کے ایک اچھے دوست پدم کانت مالویہ نے جو اس وقت موجود تھے کہا۔ مر فیع صاحب۔ بغیر چھان بین کیے آپ نے اسے دو ہزار روپئے دیے دیں۔ کیا آپ جانتے ہیں کہ۔۔۔"

قدوائی صاحب نے مسکراتے ہوئے انہیں ٹوکا۔ "ہاں بھئ یقیناً۔ میں جانتا ہوں کہ اس کے کوئی لڑکی نہیں ہے۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ وہ مخالف پارٹی کا آدمی ہے۔ وہ یقیناً کسی ایسی ہی سخت پریشانی میں مبتلا ہوگا، ورنہ وہ میرے پاس مدد کے لئے کبھی نہ آتا۔"!

1951 میں رفیع احمد قدوائی نے مرکزی کابینہ سے استعفےٰ دے دیا۔ استعفے کی وجہ کانگریس کے صدر پرشوتم داس ٹنڈن سے نظریاتی اختلاف تھا۔

اپنے معتقدوں اور پیروکاروں کے ساتھ مل کر قدوائی نے کسان مزدور پرجا پارٹی، بنائی۔ وہ یقین رکھتے تھے کہ ایک جمہوری سوسائٹی میں حزب مخالف کی باتوں پر توجہ دینا حکومت کی ذمہ داری ہے۔

نتیجے میں اجیت پرشاد جین (نوآبادکاری کے مرکزی وزیر) نے بھی استعفےٰ دے دیا۔ بال کرشن شرما نوین، نے بھی اپنا استعفےٰ جواہر لال نہرو کو پیش کر دیا۔ ظاہر ہے نہرو بہت رنجیدہ تھے۔ قدوائی نہرو کے بہت لمبے عرصے کے ساتھی تھے۔ ان کی غیر معمولی انتظامی صلاحیت کی وجہ سے نہرو ان پر بہت اعتماد کرتے تھے۔ نہرو انہیں کھونے کے لئے تیار نہ تھے۔ انہوں نے جین اور نوین کے استعفےٰ بھی منظور نہ کیے تھے۔ اس کی وجہ بھی ان لوگوں کا سیاسی تجربہ اور قابلیت تھی۔ نہرو نے ذاتی بات چیت کے ذریعے مسئلے کو حل کر لیا۔ قدوائی نہرو پر بہت زیادہ اعتماد رکھتے تھے اور انہیں تازہ تازہ آزاد ہوئے ہندوستان کا صحیح رہنما مانتے تھے۔ دوستانہ سمجھ بوجھ اور ملک کی خوشحالی کے پیش نظر اختلافات پگھل کر بہہ گئے۔

کانگریس کو 1952 کے الیکشن میں زبردست کامیابی حاصل ہوئی۔ قدوائی لوک سبھا

کے لئے بڑی اکثریت سے کامیاب ہوئے۔ الیکشن سے پہلے ملک اب تک کے سب سے بڑے غذائی بحران میں مبتلا تھا۔ ملک میں اناج کی بہت کمی تھی۔

راشن میں بہت بھاری کمی کرنی پڑی۔ اس سے پورے ملک میں احتجاج کا طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ ملک کے مغربی حصے میں سیلاب اور خشک سالی سے خریف کی فصل تباہ ہوگئی۔ اس سے قحط کی سی کیفیت پیدا ہوگئی۔ اس بحران کے دوران قدوائی نے وزارت خوراک کا چارج سنبھالا۔ نہرو کو یقین تھا کہ قدوائی ان حالات کو ٹھیک کرلیں گے۔

مسلسل دوروں پر رہنے کی وجہ سے قدوائی نے خوراک کی اصلی صورت حال سے پوری واقفیت حاصل کرلی تھی۔ انھوں نے کسان کے بھیس میں اناج منڈیوں اور گوداموں اور لین دین کا جائزہ لیا۔ ایک معمولی خریدار کی حیثیت سے راشن کی لائنوں میں کھڑے رہے۔ انھوں نے دیکھا کہ راشن بلیک مارکیٹ کی ہمت افزائی کرتا ہے۔ محکمے کی طرف سے مقرر کردہ قیمتیں اصلی قیمت سے بہت مختلف تھیں۔ لوگوں نے گودام بھر لیے تھے کیونکہ حکومت کی قیمت خرید اور بازار کی قیمتوں میں بہت فرق تھا۔

قدوائی نے محسوس کیا کہ خوراک کی صورت حال حقیقت میں اتنی خراب نہ تھی۔ انھوں نے ایک دم راشننگ ختم کرنے کے احکام جاری کردیئے۔ اس سے زخیرہ کرنے والوں نے فوری طور پر اناج بازار میں نکال دیا۔ پیداوار بہت تیزی سے بڑھنے کی وجہ سے شکر سستی ہوگئی۔ زیادہ وقت نہیں گذرا تھا کہ بازار میں اناج کی کمی نہ رہی۔ اس سے عام آدمی کو بہت سکون ملا۔ ساتھ ہی ساتھ قدوائی نے اناج کے تاجروں پر بھی کڑی نگرانی رکھی کہ وہ مقررہ قیمتوں پر اناج بیچیں۔ کنٹرول ختم ہوا، کھلے بازار میں اناج آیا تو کمی کا ماحول خود بخود خود کفیلی کے پرسکون معمول میں بدل گیا۔

قدوائی سب سے زیادہ ہردل عزیز وزیر خوراک بن گئے۔ لیکن ان کی مسلسل مصروفیت نے ان کی صحت پر بہت برا اثر ڈالا۔ ڈاکٹروں نے کچھ دن کے لئے انھیں مکمل آرام کا مشورہ دیا۔ لیکن قدوائی نے ان مشوروں کو کبھی سنجیدگی سے نہ لیا۔ انہیں ضیق النفس (سانس رکنے) کی شکایت ہوگئی۔ اور وہ ہر وقت کھنکھارتے رہتے تھے۔ وہ اپنے درد کو اپنی خوش مزاجی کے

پردے میں چھپانے کی کوشش کرتے تھے۔ انہوں نے آرام کرنے سے انکار کر دیا۔

24 اکتوبر 1954 کو قدوائی کو دہلی میں ایک عام جلسے میں تقریر کرنی تھی۔ وہ لکھنؤ، کانپور کے دورے سے واپس آئے تھے اور بہت تھکے ہوئے لگ رہے تھے۔ ڈاکٹر نے دیکھا کہ ان کا بلڈ پریشر (خون کا دباؤ) خطرناک حد تک زیادہ تھا۔ ڈاکٹر نے آرام کرنے کا مشورہ دیا۔ قدوائی مسکراتے ہوئے مان گئے۔ مگر اگلے ہی منٹ وہ کار کی طرف جھپٹے جو ان کے انتظار میں وہاں موجود تھی۔

جب قدوائی ڈائس کی سیڑھی کے قریب پہنچے، ذرا دیر کے لیے رکے، درد سے کراہے۔ اپنے باڈی گارڈ کی مدد سے وہ ڈائس پر پہنچے اور ہاتھ ہلا کر حاضرین کا خیر مقدم کیا۔ وہ زیادہ دیر نہ بول سکے۔ قدوائی زندہ باد۔ قدوائی زندہ باد کے نعروں کے بیچ وہ بے چینی سے بیٹھ گئے۔ گھر تک پہنچتے پہنچتے ان کی حالت بہت خراب ہوگئی۔ وہ اب بہت تکلیف کے ساتھ سانس لے رہے تھے۔ اور پھر انہوں نے ہمیشہ کے لئے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

رفیع احمد قدوائی کی موت کی خبر سے لوگوں کے دل ہل گئے۔ چند دن پہلے انہوں نے مذاق میں نہرو سے کہا تھا کہ تم ریٹائر ہو جاؤ۔ قدوائی وزیر اعظم ہوگا تو لوگ اپنے پیارے نہرو کو بھی یاد نہ کریں گے۔ جب نہرو کو ان کے انتقال کی خبر ملی تو انہوں نے قدوائی کا ہر جملہ دہرایا۔ نہرو اس وقت چین میں سرکاری دورے پر تھے۔ انہوں نے سوگواری سے کہا۔ "میں یہ نقصان بہت مشکل سے برداشت کر پاؤں گا۔"

جواہر لال نہرو کے الفاظ ظاہر میں اس سیدھے سادے لیکن عمل میں اس عظیم آدمی کی صحیح تصویر کھینچتے ہیں۔ "مجھے برسوں کا گزرا زمانہ یاد آتا ہے جب ہم میں سے بہت سے لوگ گاؤں میں عام جلسوں میں لمبی لمبی تقریریں کیا کرتے تھے۔ رفیع احمد نے عام جلسوں میں کبھی تقریر نہیں کی۔ ہم لوگوں کے درمیان اس پر مذاق بھی ہوتا تھا۔ وہ خاموش کارکن تھے۔ اور عام جلسوں میں تقریر کرنا انہیں کبھی پسند نہ آیا۔ ویسے وہ کافی بولتے تھے مگر پرائیوٹ گروپس میں، میٹنگ میں نہیں۔ وہ خاموشی کے ساتھ کام کرتے تھے اور شاید ہندوستان بھر میں لوگوں کو، ساتھیوں کو دوستوں کو اور کامریڈس کو ہم سب سے زیادہ جانتے تھے۔"

"ملک نے ایک قابل اور کامیاب وزیر کھودیا ہے۔ وہ شخص جو بہترین انتظامی صلاحیت رکھتا تھا۔" صدر جمہوریہ ڈاکٹر راجندر پرشاد نے اظہار تعزیت کیا۔

مسولی کے "بے تاج بادشاہ" کو لاکھوں لوگوں نے خراج عقیدت پیش کیا۔ جب وہ اپنے آبائی قصبے مسولی کو لے جائے جارہے تھے۔ ہر اسٹیشن پر عقیدت مندوں کی بھیڑ تھی۔ ان کے تابوت کے ساتھ بہت سے دوست گئے تھے۔ لال بہادر شاستری، فیروز گاندھی، کیشودیومالویہ وغیرہ اور بہت سے لیڈر۔ ایک عظیم اور رحم دل انسان کو دائمی آرام کے لئے دفن کردیا گیا۔

ونوبا بھاوے

گیتا لال سہائے

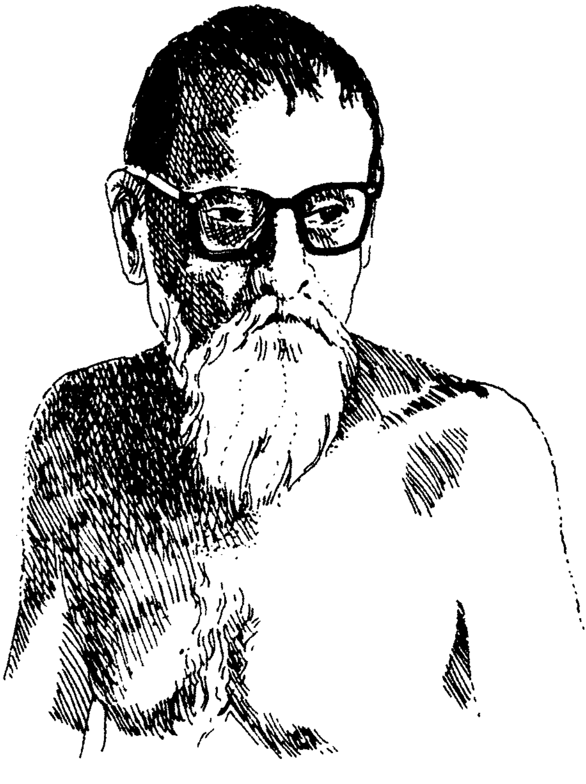

"خدا نے ہمیں دو زبردست صلاحیتیں عطا کی ہیں۔۔۔ ایک یاد داشت اور دوسری بھول۔ ہمیں یاد رکھے جانے کے قابل اور بھول جانے کے قابل چیزوں میں فرق کرنا چاہیے۔ اصلی فرق یہ ہوگا کہ ہم بری باتوں کو بھول جائیں اور دوسروں کی اچھی باتوں کو یاد رکھیں۔"

ونوبا بھاوے

ونوبا بھاوے

ایک دبلا پتلا نوجوان سا لڑکا چھوٹے سے باورچی خانے میں جلتی آگ کے پاس جاتا ہے۔ اس کے ہاتھ میں کاغذوں کا ایک گول پلندہ ہے۔ وہ آگ کے شعلوں کو دیکھتا ہے۔ ان کاغذوں پر آخری نظر ڈالتا ہے اور آہستہ سے انہیں آگ کے حوالے کر دیتا ہے۔ بھڑکتے شعلوں نے اس کی ماں کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ اس نے اپنے بیٹے کی طرف دیکھا۔ اسے تعجب ہوا۔

"تم کیا جلا رہے ہو۔؟" اس نے پوچھا۔

"اپنے سرٹیفکیٹ۔" لڑکے نے آہستگی سے جواب دیا۔

"مگر کیوں۔" فکرمند ماں نے ان کاغذوں کو آگ پر سے ہٹانے کی کوشش کی۔

لڑکے نے اسے یہ کہتے ہوئے روک دیا۔ "مجھے ان کی کبھی ضرورت نہ پڑے گی۔"

"تمہیں ان کی بغیر نوکری کون دے گا۔ تم ان سندوں کے بغیر کیا کرو گے۔" اس نے بےچینی سے پوچھا۔

لڑکا وہیں کھڑا رہا۔ اور مدھم ہوتے شعلوں کو دیکھتا رہا۔ جب کاغذات راکھ بن گئے تو اس نے اعتماد کے ساتھ جواب دیا۔ "اپنے ملک کے لئے بڑے بڑے کام۔"

اس جرات مندانہ قدم سے اس دور دیکھنے والے نوجوان نے رسمی تعلیم سے اپنے سارے ناتے توڑ لیے۔

اپنی زندگی کا عظیم مقصد رکھنے والا یہ لڑکا کوئی اور نہیں گاندھی جی کا سب سے لائق "منہ بولا بیٹا" اچاریہ ونوبا بھاوے تھا۔

دلی خواہش

ونائک نرہری مہاراشٹر کے کولابا ضلع میں ایک برہمن خاندان میں 11 ستمبر 1895 کو پیدا ہوئے تھے۔ وہ اپنے پانچ بہن بھائیوں میں سب سے بڑے تھے۔ دوسروں کی فکر کرنے والے اور مخلص۔ سب سے چھوٹے بھائی اور بہن کی ناوقت موت نے انھیں زندگی کو سنجیدگی سے سمجھنے کا سبق سکھایا۔

ونائک کے والد نرہری راؤ کپڑے کی صنعت (ٹکسٹائل ٹیکنالوجی) کے ماہر تھے۔ وہ بااصول اور قاعدے سے رہنے والے انسان تھے۔ بہاری راؤ ونائک کو نافرمانی کے لیے سزا بھی دیتے تھے۔

ونائک اپنی والدہ سے بہت قریب تھے۔ رکمنی دیوی ایک سیدھی سادی اور شریف خاتون تھیں۔ انھوں نے اپنی والدہ سے سیکھا تھا۔ "دینے والا خدا ہے اور روکنے والا شیطان۔" رکمنی دیوی غریبوں اور ضرورت مندوں کا بہت خیال رکھتی تھیں۔ ایک بار ایک تندرست بھکاری نے ان سے بھیک مانگی، انھوں نے دے دی۔

"اماں! کیا آپ تندرست آدمی کو کھانا دے کر کاہلی کی ہمت افزائی نہیں کر رہی ہیں۔"

رکمنی دیوی مسکرائیں اور آہستہ سے جواب دیا۔ "ہم مستحق اور غیر مستحق کا فیصلہ کرنے والے کون ہوتے ہیں۔" ونائک کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ اپنی موت تک وہ اس سوال کا جواب نہ پاسکے۔

رکمنی دیوی کی روحانیت نے ونائک کی زندگی اور انداز فکر کی تشکیل کی۔ وہ شادی نہ کرنے کے لئے ان کی ہمت افزائی کرتی تھیں۔ "جو آدمی اچھی شادی شدہ زندگی گذارتا ہے وہ خاندان کے لئے نیک نامی کا باعث بنتا ہے جو شادی نہیں کرتا (برہمچاری) وہ ایک نہیں بیالیس نسلوں کے لئے قربانی دیتا ہے۔"

ونائک اس پر پوری طرح یقین رکھتے تھے، چنانچہ انھوں نے پوری زندگی برہمچاری رہنے کا عہد کرلیا۔ ان کے چھوٹے بھائی بالکوبا اور شیواجی ان پر رشک کرتے تھے۔ یہ عہد ونائک نے دس سال کی عمر میں کیا تھا اور پوری زندگی اس پر قائم رہے۔

جب کبھی ونائک اپنی والدہ کا ذکر کرتے تھے، ان کی آواز جذبات سے بھرا جاتی تھی۔ ایک بار آشرم میں اپنے ایک ساتھی سے کہا "میری والدہ میری قوت کا سرچشمہ تھیں۔ انہیں میری اہلیت پر بے انتہا اعتماد تھا۔ اس زندہ یقین نے مجھے بہت قوت بخشی۔"

غالباً اسی بے حساب قوت کا نتیجہ تھا کہ 1916 میں انٹرمیڈیٹ کا امتحان دینے کے لئے جب وہ بمبئی جارہے تھے تو انہوں نے بیچ سفر میں گاڑی چھوڑ دی اور بنارس جانے والی دوسری گاڑی میں سوار ہوگئے۔ وہ وہاں اپنے آپ کو بھگوان کی خدمت میں لگادینے کے لئے گئے تھے۔ انہوں نے سنسکرت کا مطالعہ کیا، خاص طور پر ویدوں اور اپنشدوں کا۔ گیروے کپڑے پہنے، لیکن سادھوؤں کے صرف اشلوک پڑھتے رہنے سے وہ جلدی ہی بے چین رہنے لگے۔ وہ اپنے ملک کے لئے کوئی عظیم کام کرنا چاہتے تھے۔

سابرمتی

ونائک نے پہلی بار مہاتما گاندھی کی پرجوش تقریر 1916 میں بنارس ہندو یونیورسٹی کے افتتاح کے موقع پر سنی۔ ونائک نے گاندھی جی کی تحریریں بھی پڑھیں۔ انہوں نے ان سے ملنے کا فیصلہ کیا۔ ونائک سابرمتی آشرم میں 7 جون 1916 کو پہنچے۔

ونائک کی پہلی نظر جس آدمی پر پڑی وہ نیم برہنہ زمین پر بیٹھا چرخہ کات رہا تھا۔ کچھ ناامید سے ہوکر ونائک پوچھ بیٹھے "کیا یہی وہ ہتھیار ہے جس سے آپ انگریزوں کو نکال باہر کرنا چاہتے ہیں؟"

گاندھی جی نے دیکھا اور نوجوان کے بیباک سوال پر مسکرائے۔ "مجھے امید ہے کہ تم انگریز کو شیطان نہیں سمجھتے ہو۔ گڈریا اپنی بھیڑوں کا برا کبھی نہیں چاہتا۔ وہ انہیں ہانکتا ہے۔ گھاس چراتا ہے اور انہیں تندرست بناتا ہے۔ کسی کسی وقت اپنی بھیڑ کو ذبح بھی کرلیتا ہے۔ لیکن چونکہ وہ اس کی ملکیت ہیں اس لئے اپنے طور پر وہ ان کی بہتری ہی چاہتا ہے۔ چونکہ ہمیں بھیڑ بننا پسند نہیں ہے تو ہم انگریزوں سے نفرت شروع کردیتے ہیں۔ اپنے آپ کو زیادہ ظالم اور انصاف دشمن ظاہر کرنے لگتے ہیں۔ ہمارا مسئلہ ہے آپس میں ذاتوں اور فرقوں

میں بٹا ہونا۔"

گاندھی اہنسا (عدم تشدد) کی تشریح کرتے جاتے تھے اور سوت کاتتے جاتے تھے۔ اور اس کام کی اہمیت بتاتے جاتے تھے۔ جلدی ہی ونائک کی ناامیدی دور ہو گئی۔

ونائک اپنے گرو کے پیروں پر گر گیا۔ اس نے آشرم میں شریک ہونے کی خواہش کی۔ گاندھی جی نے پیار سے انہیں ونوبا کہا اور خوشی سے اپنا چیلا بنالیا۔

آشرم میں ونوبا نے ہر قسم کا کام شروع کر دیا۔ انھوں نے اپنا جنیو جلادیا۔ اکثر گرو اور چیلا مل کر کام کرتے تھے۔ بھگود گیتا اور اپنشد کے فلسفے پر بات چیت کرتے تھے۔ انہوں نے رائے ظاہر کی "ونوبا آشرم کے چند ہیروؤں میں سے ایک ہے۔ جو یہاں آیا تو خود اس کا وقار نہیں بڑھا بلکہ اس کے آنے سے آشرم کا وقار بڑھا ہے۔"

گاندھی جی کے سب سے قابل شاگرد ہونے کے باوجود ونوبا ہمیشہ انکساری سے گاندھی جی اور آشرم کو خراج عقیدت پیش کرتے تھے۔

ونوبا بھاوے کے والد کو گاندھی جی نے ایک خط لکھا تھا۔ "آپ کا بیٹا ونوبا میرے ساتھ ہے۔ آپ کے بیٹے ونوبا نے اس چھوٹی سی عمر میں جو خوش دلی اور تیاگ حاصل کرلیا ہے اس منزل تک پہنچنے میں مجھے خاموش محنت کے ساتھ برس گزارنے پڑے تھے۔"

مہاتما گاندھی ونوبا بھاوے کو اپنا گود لیا بیٹا کہا کرتے تھے۔ اور ان کے لئے "دردر نرائن" (غریبوں کا خدا) اور "کرت یوگی" (باعمل یوگی) جیسے القاب سے یاد کرتے تھے۔

ونوبا بھاوے آشرم میں سخت محنت کرتے تھے اور دوسروں سے محنت کراتے تھے۔ وہ ان سے اتنا کام لیتے تھے کہ ان میں سے کچھ نے واپس جانے کی خواہش کی۔ جب آشرم کے منیجر نے ونوبا کو اس کے بارے میں بتایا تو وہ بالکل پریشان نہ ہوئے۔ انہوں نے کہا۔ "اگر کچھ لوگ جانا چاہتے ہیں تو انہیں جانے دو۔ نظم وضبط کے پابند چند ہی ساتھی ہوں۔ اس سے کہیں بہتر ہے کہ بہت سے لوگ ہوں لیکن معیار کے مطابق نہ ہوں۔"

ونوبا بھاوے آشرم میں رہنے والے لوگوں کو کئی مضمون پڑھاتے تھے۔ جیسے گجراتی اور حساب۔ وہ ان سے بھگود گیتا پر بات چیت کرتے تھے۔ انہوں نے جسمانی محنت کو تعلیم اور

روحانیت کے ساتھ جوڑ دیا تھا۔

سخت محنت ونوبا بھاوے کے لئے پریشان کن ہوگئی۔ ان کی صحت گرنے لگی۔ انہیں آشرم سے ایک سال کی چھٹی لینی پڑی۔

یہ چھٹی کا زمانہ بھی انھوں نے تعلیم حاصل کرنے میں گزارا۔ اپنے آبائی مقام وائی میں ونوبا بھاوے نے "برہم سوتر بھاشیہ" پر شنکر آچاریہ کے لکچر سنے۔ انھوں نے اپنشدوں، بھگود گیتا، منوسمرتی، اور پاتن جلی کے یوگا سوتر، کا گہرائی سے مطالعہ کیا۔

انھوں نے یہ سب کچھ اپنی چھٹی کے پہلے چھ مہینے میں پورا کیا۔ بعد کے چھے مہینے گاؤوں میں گزاری۔ اس پیدل گھومنے کے زمانے میں انھوں نے لوگوں کی معاشی اور سماجی زندگی کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔ اسی زمانے میں انھوں نے بھگود گیتا پر تقریریں کیں اور اپنے محبوب مضمون حساب کی لوگوں کو تعلیم دی۔

ونوبا بھاوے ننگے پیر اور ننگے سر آشرم کو واپس لوٹے۔ وہ پیر کا دن تھا، گاندھی جی کی خاموشی کا دن، وہ سیدھے باورچی خانے میں پہنچے بغیر کسی کو بتائے۔

پانچ برس تک آشرم کے باسی، ونوبا بھاوے کی سرپرستی میں خوش حال رہے۔ گاندھی جی کے پہلے چیلے جمنا داس بجاج مدھیہ پردیش کے ایک دولت مند آدمی تھے۔ انھوں نے گاندھی جی سے درخواست کی کہ سابرمتی آشرم جیسے آشرم ملک کے دوسرے حصوں میں بھی کھولے جائیں۔

واردھا آشرم

8/اپریل 1921 کو ونوبا بھاوے کی نگرانی میں یہ آشرم شروع کیا گیا۔

ونوبا بھاوے نے مل جل کر رہنے کے ان ہی اصولوں پر عمل کیا جن پر سابرمتی آشرم میں عمل ہوتا تھا۔ انھوں نے روزانہ کام کا لائحہ عمل کام کی بنیاد پر تیار کیا۔

یہ قاعدہ تھا کہ آشرم کے رہنے والے صرف اتنا ہی کھائیں گے جتنا وہ پورے دن میں محنت سے کمائیں گے۔۔۔ سوت کات کر، باغیچے میں کام کرکے یا دوسرے عملی کاموں کے

ذریعے۔ کسی کو خالی بیٹھنے کی اجازت نہ تھی۔ نہ کوئی ملازم تھا نہ چوکی دار نہ صفائی والا۔ کام عبادت تھا۔ کام ہی زندگی تھا۔

کام کرنے اور پڑھانے کے علاوہ جنوری 1923 میں ونوبا بھاوے نے ایک ماہانہ رسالہ "مہاراشٹرا دھرما" شائع کرنا شروع کیا۔ اس میں ونوبا کے لکھے ہوئے مختلف موضوعات پر مضامین بھی ہوتے تھے۔ 1923 میں قومی جھنڈا لے کر چلنے پر پابندی لگی۔ اس پابندی کے خلاف احتجاج کرنے پر ونوبا بھاوے گرفتار کر لئے گئے۔ ان کی گرفتاری پر رسالے کی اشاعت بھی رک گئی۔ ونوبا کو ناگپور جیل میں رکھا گیا۔ (رسالے کی اشاعت ان کے جیل سے چھوٹنے کے بعد ہفتہ وار رسالے کی حیثیت سے دوبارہ شروع کی گئی جو 1929 تک جاری رہی)۔ قیدیوں کے ساتھ غیر انسانی برتاؤ نے انہیں ذہنی طور پر بہت پریشان کیا۔ جیل میں بھی ونوبا نے اپنا روزانہ کا عمل پوجا پاٹ اور سوت کاتنا جاری رکھا۔

کچھ دنوں کے بعد ونوبا بھاوے کا ناگپور جیل سے اکولا جیل میں تبادلہ کر دیا گیا۔ وہاں انہوں نے دیکھا کہ سیاسی قیدی کچھ کام نہیں کرتے۔ ونوبا یہ برداشت نہ کر سکے۔ "کیا تم نے گیتا میں نہیں پڑھا کہ بغیر کام کیے کھانا پاپ ہے؟۔" انہوں نے اپنے ساتھی قیدیوں کو اس پر تیار کیا کہ وہ کوئی حرفہ سیکھیں اور جو جسمانی محنت ان سے کہی جائے اسے پورا کریں۔

جیل کے افسر قیدیوں کی تبدیلی پر حیران رہ گئے۔ جو کچھ ان کا ڈنڈا نہ کر سکا تھا وہ ایک کمزور سے آدمی کے الفاظ نے کر دکھایا۔

3 / ستمبر 1923 کو ونوبا جیل سے رہا کر دئے گئے۔

ویکام میں

1924 میں گاندھی جی نے ونوبا بھاوے سے کہا کہ وہ مندر میں داخلے کے سلسلے میں ستیہ گرہ کا چارج لیں۔ ویکام ستیہ گرہ جو ہریجن چلا رہے تھے۔ انہیں کیرالا کے مشہور مندر ویکام میں داخلے کی اجازت نہ تھی۔

جب پجاریوں اور ہریجنوں کو ونوبا بھاوے کے آنے کی وجہ معلوم ہوئی تو انہوں نے

انھیں جیت لینا چاہا۔ پہلے منت سماجت سے پھر دھونس دھمکی سے۔ مگر ونوبا ڈٹے رہے۔ انھوں نے رضاکاروں (وانٹیرس) کے جتھے ایک مخصوص راستے سے مندر کی طرف بھیجے۔ پولیس نے بار بار وانٹیرس کو مارا پیٹا۔ اس طرح دن اور مہینے گزر گئے۔ لیکن ونوبا اپنے بہادر وانٹیرس کے ساتھ جمے رہے۔

آخر میں گاندھی جی بھی ان سے آملے۔ رفتہ رفتہ تحریک نے زور پکڑا۔ پولیس بہت سخت ہوگئی۔ پولیس نے راستہ بند کردیا۔ گاندھی جی اور ونوبا بھاوے نے ستیہ گرہیوں سے رات اور دن، بغیر کچھ کھائے پیئے اور آرام کیے وہیں کھڑے رہنے کو کہا۔

ویکام ستیہ گرہ چلتا رہا۔ وانٹیرس خاموشی سے تکلیف اٹھاتے رہے۔ اخبارات میں خبریں چھپیں۔ ان خبروں میں کھل کر حکومت اور پولیس کو ذمہ دار ٹھہرایا گیا۔ ستیہ گرہیوں سے لوگوں کی ہمدردیاں بڑھتی چلی گئیں۔ آخر کار، ایک سال چار مہینے میں یہ جدوجہد ختم ہوئی۔ مندر کے دروازے سب کے لئے کھول دیے گئے۔

یہ ونوبا بھاوے کی پہلی بڑی فتح تھی۔ یہ ابتدا تھی ان کے "دردر نرائن" ہونے کی۔ انھوں نے گاندھی جی کا طریقہ فکر اپنالیا تھا۔

گرام سیوا

جنوری 1931 میں ونوبا بھاوے کو گرفتار کرکے دھولیا جیل میں رکھا گیا۔ یہ گرفتاری اس لئے تھی کہ وہ ایک عام جلسے کو خطاب نہ کرسکیں۔ قید سے رہائی کے بعد انھوں نے دیکھا کہ واردھا آشرم بند ہوگیا ہے اور اس میں جو کام ہوتے تھے ان پر پابندی لگادی گئی ہے۔ وہ نالواڑی چلے گئے۔ یہ ایک ہریجن گاؤں تھا۔ واردھا سے تقریباً دو کلومیٹر دور۔ وہاں انھوں نے 1934 میں گرام سیوا منڈل (گاؤں کی خدمت کی انجمن) بنایا۔ ونوبا نے گاندھی جی کو ان کی دعاؤں اور ہمت افزائی کے لئے لکھا۔

اس نے گاندھی جی کے دل پر بہت اثر کیا۔ "تمہاری محبت اور یقین سے میری آنکھوں میں خوشی کے آنسو آگئے۔ میں اس کے قابل ہوں یا نہ ہوں۔ لیکن ان سے تمہیں

دائمی خوشی ملے گی۔ تم عظیم خدمت کا ذریعہ بنو گے۔ یہ اچھا ہے کہ تم نالواڑی چلے گئے ہو۔"

نالواڑی میں ونوبا ایک بانس کی جھونپڑی میں رہتے تھے۔ اس میں غسل خانہ نہ تھا۔ اس کی چھت گائے کے گوبر سے لیپی گئی تھی۔ اس سادی زندگی نے گاؤں کے لوگوں کے دلوں میں ان کے لئے محبت اور احترام پیدا کردیا تھا۔

نالواڑی سے ونوبا نے پدیاترائیں (پیدل سفر کرنا) شروع کیں۔ کارکن قریب کے دیہات کو بھیجے جاتے تھی۔ ہر پندرہ دن میں وہ لوگ نالواڑی میں جمع ہوتے تھے اور ونوبا سے گاؤوں کے مسائل پر بات چیت کرتے تھے۔ جب کسی ناانصافی کے خلاف مدد کی ضرورت ہوتی تو وہ پوری طاقت کے ساتھ آواز اٹھاتے۔ تینتالیس مندر اور تین سو گاؤوں کے کنویں ہریجنوں کے لیے کھل گئے تھے۔

ونوبا نے "کھادی یاترائیں" شروع کیں۔ والنٹیر گاؤوں میں جاتے تھے، لوگوں سے ملتے تھے اور کھادی، دیہی حرفے اور جانوروں کی پرورش میں مدد کرتے تھے۔ یہ مشاغل گرام سیوا منڈل کے کاموں کا حصہ بن گئے۔

مستقل شدید محنت، غریبوں کی ترقی کی مسلسل جدوجہد اور رکاوٹوں نے ونوبا کو کبھی ناامید نہیں کیا۔ وہ جتنی زیادہ محنت کرتے تھے اور جتنا معمولی کھانا کھاتے تھے اس سے ان کی صحت گرتی گئی۔ ڈاکٹروں سے مشورہ کیا گیا۔ انھوں نے دوائیں تجویز کیں۔ لیکن اس شبہ پر کہ ان میں جانوروں کی چربی ہوگی انھوں نے دوا کھانے سے انکار کردیا۔ اس کے بدلے وہ جسم پر طرح طرح سے مٹی ملتے تھے۔ اپنی روزانہ کی خوراک۔ چپاتی، دودھ، کیلے اور لیموں۔ میں ایک چمچہ شہد کا اضافہ کرلیا۔

صحت کی خرابی گھٹتی بڑھتی رہی۔ گاندھی جی اور جمنا داس بجاج کے لیے ان کی صحت ایک مستقل پریشانی کا سبب رہتی تھی۔

پونار

1938 میں گاندھی جی نے ونوبا کو مجبور کیا کہ وہ اپنا آشرم پونار میں منتقل کرلیں۔

پونار ناگپور روڈ پر ایک چھوٹا سا پہاڑی مقام تھا۔ پونار جاکر ونوبا نے آشرم کا نام بدل کر "پرم دھام"۔ روحانی گھر رکھا۔ وہاں انھوں نے ایک مسلمان عالم سے عربی سیکھی۔

ونوبا کی کتاب قرآن کے کچھ حصے، ہندی، انگلش اور اردو میں شائع ہوئے۔

اس سے پہلے 1932 میں دھولیا جیل میں، ونوبا نے بھگود گیتا کا مراٹھی نظم میں ترجمہ کیا تھا۔ ترجمے کا نام "گیتائی" یعنی گیتا ماں تھا۔ گاندھی جی گیتائی کی موسیقیت سے بہت متاثر ہوئے۔ ان کے خیال میں وہ بہت ہی اچھی تھی۔ شیواجی، ونوبا کے چھوٹے بھائی گاندھی جی کو روزانہ اپنی سریلی آواز میں گیتا، سے کچھ شعر سنایا کرتے تھی۔

پونار میں ونوبا بھاوے نے اپنے ادبی مشاغل کو جاری رکھا اور اس کام میں وہ کئی گھنٹے گزارتے تھے۔

اس آشرم میں ونوبا نے خود کو عوامی کاموں سے مکمل طور پر الگ کرلیا اور فقیری زندگی گذارنے لگے۔ انھوں نے لوگوں سے ملنا بھی بند کردیا۔

ایک بار آچاریہ کرپلانی ان سے ملنے گئے۔ وہ آدھے گھنٹے تک یہ سوچ کر انتظار کرتے رہے کہ ونوبا پوجا کررہے ہیں۔ جب آدھے گھنٹے کے صبر آزما انتظار کے بعد بھی ونوبا نے ان سے بات نہ کی تو وہ چلے گئے۔ بعد میں انھوں نے گاندھی جی سے شکایت کی۔ "میں کبھی آپ کے ونوبا سے زیادہ مغرور آدمی سے نہیں ملا۔"

گاندھی جی مسکرائے اور ان سے ہمدردی کا اظہار کیا۔ "پروفیسر یہ غرور نہیں ہے۔ بلکہ توجہ کو کسی نقطے پر قائم کرنا (مراقبہ) ہے جو روحانی کاوش کی معیار ہے۔"

آشرم میں ونوبا نے روپے پیسے والی اقتصادیات سے چھٹکارے کا تجربہ شروع کیا۔ اس کا نام انھوں نے "کنچن مکتی" رکھا تھا۔ انھوں نے آشرم چلانے میں روپے اور سکوں کا استعمال بند کردیا۔ آشرم میں رہنے والے اپنے لیے غلہ اگاتے تھے۔ دودھ والے جانور پال کر دودھ کا انتظام کیا گیا تھا۔ سوت کاتا جاتا اور ضرورت کا کپڑا بن لیا جاتا تھا۔ ان کا یہ فیصلہ کہ وہ صرف اپنے کاتے سوت کی دھوتی پہنیں گے ان کے آخری دن تک قائم رہا۔ ایک چھاپہ خانہ (پرنٹنگ پریس) قائم کیا گیا تھا۔ آبپاشی کے لئے کنویں کھودے گئے۔

مختصر یہ کہ ونوبا بھاوے نے آشرم کو تھوڑے سے عرصے میں خود کفیل بنالیا تھا۔ اس خود کفیل (اپنی ضرورتیں خود پوری کرنے والا) نمونے سے بوڑھے اور جوان یکساں متاثر ہوتے تھے۔ چونکہ ونوبا نقد عطیوں (چندے وغیرہ) کے خلاف تھے۔ عقیدت مند آتے تھے اور آشرم میں کام کرتے تھے۔ یہ شرم دان (محنت کا عطیہ) تھا۔

ستیہ گرہ

دوسری جنگ عظیم شروع ہوگئی تھی۔ برطانیہ نے ستمبر 1939 میں جرمنی کے خلاف جنگ کا اعلان کردیا۔ کانگریس اپنی اس رائے پر مضبوطی سے قائم تھی کہ ہندوستان کو بغیر ہندوستانیوں کی رائے کے جنگ میں نہیں گھسیٹنا چاہیئے۔ وائسرائے نے اس کے خلاف عمل کیا۔ گاندھی جی نے احتجاج کے طور پر انفرادی سول نافرمانی کی تحریک شروع کرنے کا فیصلہ کیا۔ ونوبا بھاوے پہلے ستیہ گرہی چنے گئے۔

تحریک 17 اکتوبر 1940 کو شروع کی گئی۔ گاندھی جی جانتے تھے کہ ستیہ گرہ میں کوئی کمی نہ رہے گی۔ اس ستیہ گرہ کے دوران ونوبا تین بار گرفتار ہوئے۔

برطانوی حکومت کو جنگ کی کوششوں میں ہندوستانیوں کے تعاون کی شدید ضرورت تھی۔ انہوں نے مارچ 1942 میں بات چیت کے لئے سر سٹیفرڈ کرپس کو بھیجا۔ بات چیت ناکام ہوگئی۔

8 اگست 1942 کو "ہندوستان چھوڑو" تجویز پاس ہوئی۔ اس سے پہلے کہ تحریک شروع کی جاسکتی، گاندھی جی اور تمام قومی سطح کے رہنما گرفتار کرلئے گئے۔ جن میں ونوبا بھاوے بھی شامل تھے۔ بغیر رہنما کے لوگوں نے جس طرح بھی ممکن ہوا بغاوت کردی۔ دوسری طرف حکومت نے تحریک کو کچلنے کے لئے ہر ممکن طریقہ اپنایا۔

جنگ ختم ہونے کے بعد مارچ 1946 میں برطانوی حکومت نے ایک وزارتی وفد، اقتدار کی منتقلی کے بارے میں بات چیت کے لئے ہندوستان بھیجا۔ اس کے نتیجے میں جواہر لال نہرو کی قیادت میں ایک عارضی حکومت کا قیام عمل میں آیا۔

15 اگست 1947 کو ملک کی تقسیم کے ساتھ ہندوستان آزاد ہوا۔
انگریز چلے گئے لیکن جانے سے پہلے فرقہ پرستی کا بیج بوگئے۔ آزادی کے بعد جو خون خرابہ ہوا اس سے ونوبا بھاوے کو بہت تکلیف ہوئی۔ "یہ سب کیوں؟" وہ اکثر درد کے ساتھ کہتے تھے۔

رحم کا مشن

ہندوستان کی تقسیم سے ونوبا بھاوے کو سخت تکلیف ہوئی۔ وہ اسے ہمالیہ کے برابر غلطی کہتے تھے۔ وہ گاندھی جی سے ملنا چاہتے تھے تاکہ اس طریقے پر گفتگو کریں کہ ہندو مسلمانوں کے دلوں سے کیسے نفرت دور کی جائے۔ لیکن وہ دن کبھی نہ آیا۔ 30 جنوری 1948 کو گاندھی جی قتل کردئے گئے۔

گاندھی جی کے قتل نے ونوبا بھاوے کو ہلاکر رکھ دیا۔ وہ چپ رہ گئے۔ مگر جلد ہی انہوں نے اس غم پر قابو پالیا، اور عام جلسوں کو خطاب کرنا منظور کرلیا تاکہ لوگوں کو ایک دوسرے کو قتل کرنے سے باز رکھنے کی تلقین کرسکیں۔ "ان کی (گاندھی جی کی) موت بہت شاندار تھی۔ وہ اس وقت مرے جب ان کے ذہن کا مرکز مکمل طور پر بھگوان تھا۔ اور اس لئے غم یا ناامیدی کی کوئی بات نہیں۔" انہوں نے لوگوں سے کہا کہ "ایسی کوئی بات نہ کریں جس سے گاندھی جی کو تکلیف ہو۔"

جب فسادات کے حالات پر کچھ قابو پالیا گیا تو شرنارتھیوں (پناہ گزینوں) کی آبادکاری کا مسئلہ پیدا ہوا۔ بہت سے شرنارتھیوں نے اپنے رشتے داروں کو کھودیا تھا یا ان کے پاس زندگی گزارنے کا کوئی سہارا بھی نہیں رہا تھا۔ ان کی آبادکاری صرف حکومت کے بس میں نہ تھی۔ اس مسئلے کو حل کرنے کے لئے ونوبا بھاوے جیسی حساس شخصیت کی ضرورت تھی۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے ونوبا کو دعوت دی تاکہ وہ شرنارتھیوں کی تسکین اور آبادکاری کے مسئلے میں حکومت کی مدد کریں۔

یہ پیغام ملنے پر، 30 جون 1948 کو ونوبا دلی پہنچ گئے۔

ونوبا بھاوے نے ایک میٹنگ کی۔ انہوں نے کہا "یہ بات یقیناً ضروری ہے کہ شرنارتھی لوگوں کے نقصانات کا جائزہ لیا جائے۔ لیکن یہ میرا خاص کام نہیں ہے۔ میرا بنیادی مشن یہ ہے کہ نفرت اور تلخی کے موجودہ ماحول کو امن، آپسی میل جول اور خیرسگالی کی آب وہوا میں تبدیل کیا جائے۔ تشدد سے تشدد پر قابو نہیں پایا جاسکتا۔ صرف محبت ہی ایسا ماحول بنانے میں مددگار ہوسکتی ہے۔ اور یہ کام حکومت کے بس کا نہیں۔"

ونوبا نے تقریباً دس مہینے شرنارتھیوں میں دلی اور اس کے آس پاس کے علاقوں میں گزارے۔ وہ مذہب کو سیاست کا آلہ کار بنانے کے خلاف کھل کر بات کرتے تھے۔ "مذہب ایک ذاتی معاملہ ہے۔ موسیقی کے ساز سے مختلف سر مل کر ہی خوشگوار موسیقی پیدا ہوسکتی ہے۔ اگر ایک ساز میں صرف ایک ہی سر ہے تو اس سے اچھی موسیقی پیدا نہیں ہوگی۔"

لوگ بڑی تعداد میں ان کی باتیں سننے کے لئے آتے تھے۔ نوبا بھاوے صبروسکون کے ساتھ ان کے غمناک حالات سنتے، ان کے آنسو پونچھتے ونوبا کا شرنارتھیوں سے ایک ذاتی رشتہ پیدا ہوگیا۔ وہ کبھی زیادہ وقت ایک جگہ نہیں ٹھہرتے تھے۔ ایک کیمپ سے دوسرے کیمپ جاتے رہتے تھے۔ وہ مسلسل حرکت میں رہتے تھے۔ اس بات کی کوشش کرتے تھے کہ لوگوں کو اپنے بس بھر زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچا سکیں۔

وہ درویش ایک جگہ سے دوسری جگہ، ایک کیمپ سے دوسرے کیمپ جاتا اور لوگوں سے ماضی کو بھول جانے کی اپیل کرتا تھا۔ وہ لوگوں سے کہتے کہ جو پاکستان کررہا ہے تم اس کی پیروی نہ کرو۔ یا جو تمہارے رشتے داروں کے ساتھ پاکستان میں ہورہا ہے اس پر عمل نہ کرو۔ ونوبا لوگوں سے درخواست کرتے کہ وہ یہ سمجھیں کہ وہ سیکولر (غیر مذہبی) ہندوستان کے شہری ہیں "ہندوراشٹر" کے نہیں۔

یہ ونوبا بھاوے کی ہی دین تھی کہ ان کی مدد سے حکومت میو مسلمانوں کا مسئلہ حل کرنے میں کامیاب ہوئی۔ یہ لوگ شروع میں اپنا سازوسامان اور جائدادیں چھوڑ کر پاکستان چلے گئے تھے۔ ان کی غیر حاضری میں ہندوؤں نے ان پر قبضہ کرلیا تھا۔ جب میو واپس ہندوستان آئے تو انہوں نے اپنی چیزوں کی واپسی کا مطالبہ کیا۔ حکومت کے لوگوں کی سمجھ

میں نہیں آرہا تھا کہ اس حساس مسئلے کو کیسے حل کریں۔ ونوبا آگے آئے۔ انہوں نے ہندوؤں سے اپیل کی کہ وہ جائدادیں وغیرہ واپس کردیں۔ اور اس کے بدلے میں حکومت انہیں دوسری جگہ زمین دے دے۔

دلی میں اپنا کام پورا کرنے کے بعد ونوبا بھاوے پنجاب، بیکانیر، اجمیر، حیدرآباد اور بڑودہ گئے۔ جہاں بھی وہ جاتے ہزاروں کی تعداد میں لوگ اپنے مسائل لے کر ان کے پاس آتے تھے۔

جس طرح بھی ہوتا ونوبا بھاوے ان کی مدد کرنے کی کوشش کرتے۔ "ہندوستان سب ہی فرقوں کا ہے۔ ہم اس مٹی سے پیدا ہوئے ہیں اور اسی میں مل جائیں گے۔ ہمیں ایک دوسرے سے محبت کرنی چاہئے۔ اپنے دلوں میں دوسروں کے لئے جگہ ہونی چاہئے۔ اور بھائیوں کی طرح رہنا چاہئے۔"

ڈیڑھ سال گذر گیا۔ ونوبا ایک جگہ سے دوسری جگہ سفر کرتے رہے۔ ان کی صحت خراب ہونے لگی۔ وہ واردھا آشرم واپس چلے گئے۔

ونوبا بھاوے ماہنامہ "سروودیہ" نکالنے میں مصروف ہوگئے۔ یہ رسالہ سروودیہ سماج کا جریدہ تھا۔ یہ ادارہ گاندھی جی کے انتقال کے بعد ونوبا اور پنڈت نہرو کی کوشش سے وجود میں آیا تھا۔

سروودیہ سماج کا بنیادی مقصد ایک ایسی سوسائٹی تیار کرنا تھا جس کی بنیاد سچائی اور عدم تشدد پر ہو۔ ذات اور فرقوں کے فرق کے بغیر جو سب کو پنپنے اور ترقی کے مواقع فراہم کرسکے۔ جو لوگ گاندھی جی کے خیالات پر چلنے کے لئے تیار ہوں اس سماج کے ممبر ہوسکتے تھے۔ سروودیہ سماج کے ممبروں نے طے کیا کہ وہ ہر سال 30 جنوری کو دلی میں ملا کریں گی۔ اس تاریخ کو گاندھی جی کا انتقال ہوا تھا۔

بھودان

1951 میں ونوبا بھاوے نے تلنگانہ کے علاقے میں بے چینی کے بارے میں سنا۔

15 اپریل 1951 کو رام نومی کے دن انہوں نے اپنے امن سفر کی ابتدا کی۔ "اس سفر میں یا اس کے بعد کیا ہوگا۔ یہ بات صرف بھگوان کو معلوم ہے۔" اپنے اس مشن پر روانہ ہونے سے پہلے انہوں نے کہا۔

اپنی پدیاترا (پیدل سفر) کے دوران انہوں نے پولیس کی حفاظت قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ "مجھے قتل یا گولی سے کوئی پریشانی نہیں ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ عظیم باتیں لہو کے غسل سے نکلتی ہیں۔ ہمیں اپنے دماغوں کو ٹھنڈا رکھنا چاہیئے اور امن کو واپس لانے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ آپ پولیس کے لوگوں سے اصلاحات کی توقع نہیں کر سکتے۔" ونوبا نے کہا۔

جب وہ تلنگانہ پہنچے تو ونوبا بھاوے نے غریب لوگوں کو پریشان پایا۔ ان کے ساتھ کے دوسرے لوگ تو آرام کرنے لگے لیکن ونوبا نے آرام نہ کیا۔ وہ ایک ہریجن گاؤں میں چلے گئے تاکہ صحیح حالات معلوم کر سکیں کہ لوگوں کی مالی حالت کیا ہے۔

ایک جھونپڑی میں جذباتی ہو کر ایک ہریجن بچے کو گود میں لے لیا۔ اس کا بہت اثر ہوا۔ چند منٹ کے اندر ان کے گرد بھیڑ جمع ہوگئی۔ لوگ اپنی حالت بتانے لگے۔ "ہم سب لوگ بہت ہی غریب ہیں۔ ہمارے پاس کام نہیں ہے۔ ہمیں تھوڑی سی زمین دے دیجئے تاکہ ہم اس پر خوب محنت کر کے کچھ کما سکیں۔"

ونوبا بھاوے کیا جواب دیتے۔ بہر حال انہوں نے لوگوں کو شام کو کتائی کی کلاس میں آنے کی دعوت دی۔

کوئی چالیس کے قریب خاندان شام کو ونوبا سے سیکھنے کے لیے جمع ہوئے۔ انہوں نے گروپ کتائی کرائی۔ گاؤں والوں نے اپنی درخواست دہرائی۔

"آپ لوگوں کو کتنی زمین چاہیئے۔" ونوبا نے پوچھا۔

"صرف 80 ایکڑ۔" جواب ملا۔

ونوبا بھاوے گہرے مراقبے میں چلے گئے۔ وہاں مکمل خاموشی تھی۔ چند منٹ بعد ونوبا نے آنکھیں کھولیں۔ انہوں نے ان سے بڑی نرمی سے کہا۔ کیا یہ ممکن ہے کہ کوئی

زمیندار گاؤں سے غریبی، تکلیف اور بے کاری دور کرنے کے لئے زمین دے ؟"

وہاں مکمل خاموشی تھی۔ یکایک رام چندر ریڈی (ایک زمیندار) نے اس بے یقینی کی خاموشی کو توڑا۔ وہ کھڑا ہوا اور اعلان کیا "میں ایک سو ایکڑ زمین تحفے میں دوں گا۔"

ونوبا پر اس کا بہت اثر ہوا۔ ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ انہوں نے کہا۔ "میں یہاں خالی ہاتھ آیا تھا اور اگلے گاؤں بھی خالی ہاتھ جاؤں گا۔ لیکن اس دان کے ذریعے بھگوان نے مجھے ایک اشارہ دیا ہے۔"

اس طرح مشہور بھودان (زمین کا تحفہ) تحریک کی ابتدا ہوئی۔ ونوبا خود بھی حیران تھے کہ زمین اس طرح تحفے میں دی جا سکتی ہے۔ انہوں نے محسوس کیا کہ یہ بھگوان کی مرضی تھی۔ "آدمی صرف اپنی سوچ کی مضبوطی پر عمل نہیں کر پاتا۔ ایسے عظیم عمل کی پشت پر خدائی طاقت کا ہاتھ ہوتا ہے۔ میں عقیدہ رکھنے والا آدمی ہوں۔ اگر بھگوان مجھ سے کام لینا چاہتا ہے تو میں گاؤں گاؤں جاؤں گا اور غریبوں کے لئے زمین کا تحفہ مانگوں گا۔"

دوسرے ہی دن ونوبا اپنے سفر پر روانہ ہو گئے۔ اگلے گاؤں میں انہوں نے ریڈی کے شریفانہ برتاؤ کا ذکر کیا۔ انہوں نے زمینداروں کو اس قسم کے تحفے دینے کے لئے اکسایا۔ اور ایک شخص کھڑا ہوا اور اس نے بھی زمین کے تحفے کی پیش کش کی۔

ونوبا بھاوے بہت خوش تھے۔ ان کا ہندوستان کی غریبی دور کرنے کا خواب سچ ہوتا نظر آ رہا تھا۔ وہ ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں گئے۔ وہ لوگوں سے اپیل کرتے تھے۔ "میں ان لوگوں کی بات کہنے کے لئے آیا ہوں جو خود نہیں کہہ سکتے ... میں آپ سے یہ درخواست کرتا ہوں کہ میں آپ کا آخری بیٹا ہوں جو بہت دن تک دور رہا ہے ... اگر آپ کے خاندان میں پانچ افراد ہیں، میں جو آخری آنے والا ہوں چھٹا ہوا۔ کیا آپ مجھے وراثت میں سے میرا حصہ نہیں دینا چاہتے ... لیکن یہ چیزیں غور طلب ہیں۔ جائیے سوچیے اور پھر جلدی ہی واپس آئیے۔"

لوگ چلے گئے، لیکن جلدی ہی زمین کو تحفے میں دینے کے کاغذات لے کر واپس آئے۔ رام گڑھ اور محمود پور کے راجہ، اماون شکاری کے راجکمار، دمراؤ کے مہاراجہ، اور رام بیگھا کے

بھاجی سب نے زمین تحفے میں دی۔

جن دنوں میں زمین کا تحفہ نہ ملتا تھا ان دنوں میں ونوبا نہ کھانا کھاتے تھے نہ آرام کرتے تھے۔ مگر ایسے دن بہت ہی کم تھے۔

ونوبا بھاوے کا یہ تاریخی دورہ 51 دن چلا۔ ان دنوں میں وہ 200 گاؤں میں گئے۔ 12,200 ایکڑ زمین، بے زمین لوگوں میں تقسیم کرنے کے لیے ملی۔

بعد میں زمین کے علاوہ، ونوبا نے روپے اور جائداد میں حصے کا بھی مطالبہ کیا۔ "کوئی صاحب کچھ رقم یا جائداد بھی دے سکتے ہیں۔ کسی نے کسی رقم کی پیش کشش کی۔ "دوسرا اپنی تنخواہ کا کچھ فی صد پیش کرسکتا تھا۔" اسے "سمپتی دان" (دولت کا تحفہ) کہا گیا۔ اس طرح ونوبا نے مہاتما گاندھی کے ٹرسٹی شپ (جو لوگ چاہیں اپنی جائداد یا رقم وصیت کرکے نیک کاموں کے لیے چھوڑ سکتے ہیں) کے خواب کو عملی شکل دے دی۔ ٹرسٹی شپ ایک ایسا خواب تھا جس پر یقین نہیں آتا تھا، لیکن ونوبا نے اسے ثابت کردیا۔

جب ونوبا بھاوے کے والد کا انتقال ہوا تو انہیں 25000 روپے، ایک لائبریری اور گگوڈا میں 450 ایکڑ زمین ورثے میں ملی۔ ونوبا نے روپیہ گرام سیوا منڈل کو تحفے میں دے دیا۔ خاندانی زمین تقسیم کردی گئی۔ گگوڈا کو گرام دان (یعنی تحفے میں ملا گاؤں) کہا جانے لگا۔ اس طرح ونوبا نے ذاتی چیزوں کی تقسیم کرکے اپنی ذات سے مثال قائم کی کہ وہ صرف دوسروں کی زمینیں ہی تقسیم نہیں کراتے اپنی زمین بھی انھوں نے تقسیم کردی۔

جواہر لال نہرو نے انہیں دلی بلایا اور انہیں لینے کے لئے ہوائی جہاز بھیجنے کی پیش کش کی۔ لیکن ونوبا نے یہ کہہ کر انکار کردیا۔ "میں اپنے خاص طریقے سے ہی آؤں گا۔"

انھوں نے اپنا پیدل سفر شروع کیا۔ اور دو مہینے میں دلی پہنچے۔ اور راج گھاٹ کے قریب ایک بانس کی جھونپڑی میں ٹھہرے۔ وہ بڑے لوگوں سے جھونپڑی میں ہی ملتے تھے۔ دس دن کے بعد وہ بے آرام ہوگئے۔ "میں بڑے شہروں کو پسند نہیں کرتا۔"

اب یہ کمزور آدمی ایک شال میں لپٹا ہوا، ایک ہری ٹوپی پہنے، جس کے دونوں طرف کی پٹیاں کانوں کو ڈھک کر تھوڑی کے نیچے بندھی ہوئی ہوتیں، ایک بار پھر پدیاترا پر روانہ

ہوا۔ انھوں نے ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں سفر کیا۔ اس وقت وہ لوگوں کو بھودان، سمپتی دان، اور گرام دان کے بارے میں بتاتے جاتے تھے۔ ان باتوں کے ساتھ وہ خاص طور پر گرام دان کی بات کرتے تھے۔ وہ ایسے گاؤں بنانا چاہتے تھے جہاں ذات پات کا فرق نہ ہو۔ تاکہ غریبوں میں خود اعتمادی پیدا ہو۔ وہ چاہتے تھے کہ گاؤں کی ساری زمین ایک کونسل (جماعت) کی ہو۔ ونوبا کہتے تھے کہ دان، تحفہ نہیں ہے بلکہ حصہ داری ہے۔ کوئی آدمی زمین یا جائداد کا مالک نہ ہو۔ ہر چیز سماج کی ہو خدا یا بھگوان کی ہو اور اگر بھگوان باپ اور ماں ہے تو ان کی ہر چیز کے ان کے تمام بچے مالک ہوں۔

1958 میں ونوبا بھاوے کو میگ سے سے ایوارڈ سے نوازا گیا۔

چمبل میں

ونوبا بھاوے نے جنوب سے شمال اور مغرب سے مشرق میں پورے ملک کے دوروں میں لوگوں کے دل بدلے تھے۔ صرف زمینداروں اور دولت مند لوگوں نے ہی ان کی آواز پر لبیک نہیں کہا بلکہ ڈاکوؤں نے بھی ان کے پیغام پر مناسب رد عمل ظاہر کیا۔

7 مئی 1960 کو ونوبا بھاوے نے میجر جنرل یادو ناتھ سنگھ کے ساتھ خوفناک چمبل گھاٹی کا دورہ کیا۔ ان کا عقیدہ تھا کہ کوئی آدمی ڈاکو پیدا نہیں ہوا۔ بدنام ڈاکو لچھی، جس کے سر پر 5000 روپئے کا انعام تھا، ونوبا کے پاس آیا اور ان کے پیروں پر ہتھیار رکھ دئے۔ اس نے کہا۔ "میں نے اخباروں میں پڑھا کہ آپ چمبل کے علاقے کا دورہ کر رہے ہیں۔ مقصد ہے ہم سے کہنا کہ ہم ہتھیار ڈال دیں اور اپنے کیے پر افسوس کریں۔ میں غلط راستہ چھوڑنا چاہتا ہوں۔ میں اپنے آپ کو اور اپنے خاندان کو آپ کے حوالے کرتا ہوں۔"

"یہ سب اس کی (بھگوان کی) مرضی ہے۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ میں مالک کے سامنے ہوں۔" ونوبا نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

یہ ابتدا تھی۔ کچھ دنوں میں گیارہ خطرناک ڈاکوؤں نے لکا کی سرداری میں، اپنے آپ کو حوالے کر دیا۔ ان سب نے اعلان کیا۔ "ہم نے اب تک بہت برے کام کئے ہیں۔ اور ہم

ان کے لئے شرمندہ ہیں۔" عام لوگ اور پولیس والے حیران تھے کہ اس معمولی درویش جیسے گاندھی جی کے چیلے میں کیا طاقت ہے۔

ونوبا بھاوے نے اپنا مشن 7 جون 1960 تک جاری رکھا۔ وہ دن میں بارہ چودہ کلومیٹر سفر کرکے 26 گاؤں میں جاتے تھے۔ یہ تمام گاؤں بدنام ڈاکوؤں کے نام سے پہچانے جاتے تھے۔ سب ملاکر 20 ڈاکوؤں نے اپنے کو ان کے حوالے کیا۔ ان میں خطرناک گروہ کے مان سنگھ۔ روپا بھی شامل تھے۔ اس گروہ کے سروں پر 20 ہزار کا انعام تھا۔

ونوبا بھاوے نے ان ڈاکوؤں کے دلوں کو بدل ڈالا۔ انہوں نے ان سے ملک کے قانون کے مطابق سزا بھگتنے کے لئے کہا۔ ڈاکوؤں نے اپنی غلطیاں مان لیں۔ یہ مقدمے شروع ہونے سے پہلے ختم ہوگئے۔

سمادھی

چمبل سے ونوبا راجستھان گئے۔ وہاں سے کسی دوسری ریاست، کسی اور شہر گئے۔ اور "سرودیہ" جو انسان کی ترقی اور فلاح کی تحریک ہے، اسے لوگوں کو سمجھاتے گئے۔ جس میں ذات پات، نسل یا مرد عورت کا فرق نہ ہو، نوع انسانی کی بہتری کی تحریک، صحت کی خرابی، معمولی غذا دہی اور شہد، لیکن ونوبا نے پیدل سفر (پدیاترا) کبھی نہ چھوڑی۔

عدم تشدد، بھائی چارہ، محبت، انصاف، غریبی اور چھوت چھات دور کرنے کی تلقین کرتے ونوبا کا سفر جاری رہا۔ وہ چلتے ہی گئے۔ رکے نہیں۔ وہ کرم یوگی تھے۔ یعنی نتیجے سے بے پرواہ ہوکر کام کرتے رہنے والے۔ "میرے تمام کاموں میں گیتا نے میری رہنمائی کی ہے۔" وہ کہا کرتے تھے۔

1982 میں، جب ان کی عمر 48 سال تھی انہوں نے برت رکھا اور گاؤکشی کے خلاف تحریک چلائی۔

اس کے بعد وہ زیادہ دن زندہ نہ رہے۔ 5 نومبر کو انہیں ایک معمولی سا دل کا دورہ پڑا۔ اس دورے کے تین دن بعد انہوں نے کچھ بھی کھانے سے انکار کردیا۔ اس وقت کی وزیر

اعظم اندرا گاندھی پونار گئیں اور ان سے کھانے کو کہا۔ انھوں نے یہ کہتے ہوئے انکار کر دیا۔ "یہ بہتر ہے کہ میں جسم کو چھوڑ دوں، اس سے پہلے کہ جسم مجھے چھوڑ دے۔"

15 نومبر کو صبح ساڑھے نو بجے، یہ عظیم معلم، درویش انتقال کر گیا۔ ان کی گود لی بیٹی مہادیو بتائی نے ان کی چتا کو آگ دی۔

جمنا لال بجاج کے لفظوں میں ونوبا بھاوے ایک بہت بڑے رشی تھے۔ بالکل ہندوستان کی روایت کے مطابق۔ وہ چودہ زبانوں کے ماہر تھے۔ انھوں نے لوگوں کو امن اور بھائی چارے کا پیغام دیا۔ ان کی کوئی ذاتی خواہش تھی نہ کوئی خوف، نہ پریشانی، نہ افسوس نہ فکر۔ وہ صحیح معنوں میں گاندھی جی کے پیروکار تھے۔ انھوں نے تمام عمر اپنے گرو، گاندھی جی کی طرح کام کرتے گزار دی۔

ونوبا بھاوے کی زندگی ایک مثال تھی۔ ایک ایسی زندگی جو کسی بھی خواہش سے پاک تھی۔ ان کی صرف ایک خواہش تھی کہ ہندوستان ایک ایسا ملک بنے جہاں ذات پات نہ ہو۔

ہندوستان کو ان کی ضرورت تھی۔ انھوں نے ہندوستان کو ترقی کی راہ دکھانے کا وہی زبردست کام کیا جو دوسرے غیر معمولی لوگوں نے کیا تھا۔

"ہم پوری دنیا کے ہیں۔ بس ہمیں ایک ملک پر فخر نہیں کرنا چاہیئے۔ نہ ہمیں کسی فرقے یا ذات کے ساتھ باندھنا چاہیئے۔ ہمیں پوری دنیا کے بہترین خیالات کو سمجھنا چاہیئے۔ انہیں جذب کرنا چاہیئے۔ ہماری کوشش ہونی چاہیئے کہ نظریاتی اختلاف ختم ہوں۔ یہی ہماری کامیاب نسل کی پہچان ہوگی۔

ونوبا بھاوے

شیاما پرساد مکھرجی

این۔ این۔ چٹرجی

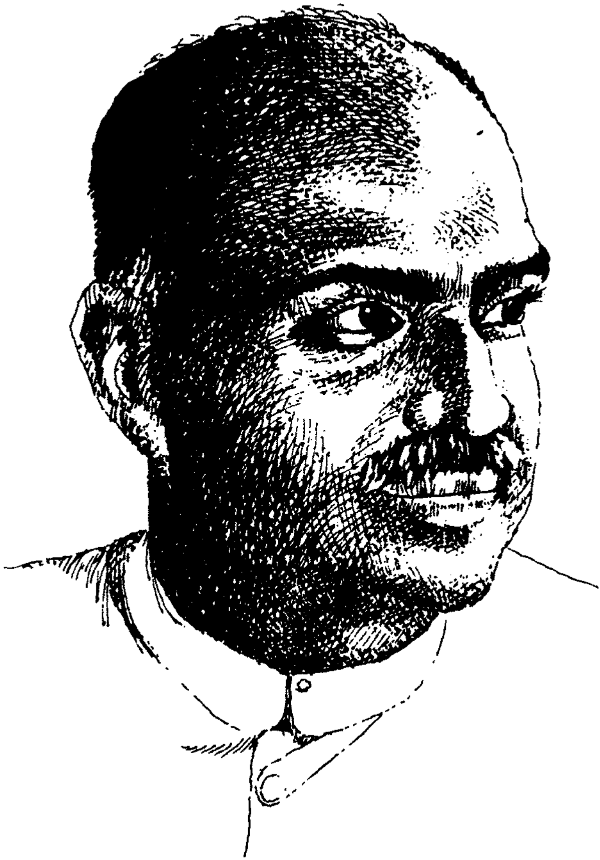

"ڈاکٹر شیاما پرساد مکھرجی نے ہر بنگالی کو اس قابل بنادیا کہ وہ کم از کم اپنی عزت نفس کے کچھ حصے کو بچا سکے۔ انھوں نے اپنے چاروں طرف دیکھا۔۔ ایک آدمی ایسا پایا کہ جو عظیم سانچے میں ڈھلا ہوا تھا۔ اور جس کی شخصیت انیسویں اور بیسویں صدی کے رہنماؤں کی روایات کے مطابق بنی تھی۔ جس نے بنگال کو ہندوستان کا نمبر ایک صوبہ بنادیا۔"

بھانی بھوشن مکھرجی
چیف جسٹس کلکتہ ہائی کورٹ

شیاما پرساد مکھرجی

کچھ لوگ سماج میں حرکت پیدا کرتے ہیں۔ کچھ لوگ ایک ایسی قوت پیدا کرتے ہیں جو موجودہ خراب حالات کو یکسر بدل ڈالتے ہیں۔ یہ دوسری حالت بنگال میں راجہ رام موہن رائے 1772۔1883 کی سماجی اصلاح اور پہلی جنگ آزادی 1857 کے درمیان تھی۔ عوامی بیداری پختہ کاری تک پہنچ گئی تھی جس نے بنگال کے لوگوں کی زندگی کو بہت متاثر کیا تھا۔ اسی زمانے میں کچھ عظیم شخصیتیں ابھریں جنہوں نے قوم کو ترقی کے راستے پر گامزن کرنے کا چیلنج قبول کیا۔

بنگال عاقلوں نے مسائل کو نئے زاویے سے دیکھنا شروع کیا اور نسلوں پرانی روایت پرستی کے خلاف عوامی تحریک شروع کی۔ سماجی مسائل پر غور وفکر اور تعلیمی ضرورت کے احساس نے انھیں فوری طور پر متحرک بنادیا۔

شیاما پرساد مکھرجی کے والد اشوتوش مکھرجی اسی زمانے سے تعلق رکھتے تھے۔ انھیں نئی بیداری کا فلسفہ ورثے میں ملا تھا۔ وسیع انسانیت اور ترقی پسندی۔ وہ بھی اس زمانے کے متحرک حالات کی پیداوار تھے۔

اشوتوش مکھرجی انگریزوں کی ہندوستانیوں کے خلاف تفریق کی پالیسی سے متاثر تھے۔ انھیں یقین تھا کہ صرف عوام میں اعلیٰ تعلیم ہی ان کے ذہنی احساس کمتری کو دور کرسکتی ہے۔

خاندان

اشوتوش مکھرجی کے والد گنگا پرساد مکھرجی اپنے مزاج کے لحاظ سے ایماندار اور نڈر آدمی تھے۔ وہ اپنے ملک اور اس کی تہذیب سے بہت پیار کرتے تھے۔ کلکتہ کے میڈیکل کالج کے پرنسپل نے انہیں وائسرائے کے ملٹری سکریٹری کے پاس ایک عارضی عہدے پر تقرری کے لئے بھیجا۔ ان کا ہندوستانی لباس رکاوٹ بنا۔ ملٹری سکریٹری ان کے کاغذات دیکھ کر مطمئن ہوا۔ لیکن اس نے دھوتی پہنے ہوئے امیدوار کو پتلون پہننے کا مشورہ دیا۔

گنگا پرساد مکھرجی واپس آگئے اور انہوں نے میڈیکل کالج کے پرنسپل سے کہا کہ ملٹری سکریٹری کو ایک میڈیکل آدمی سے زیادہ پتلون میں دلچسپی تھی۔

شیاما پرساد کا خاندان اور سماجی ماحول جس میں وہ پلے بڑھے ان کے کردار، اچھے مقصد کے لئے ان کے کام اور یقین کامل اور ملک کے لئے ان کی بہت سی قربانیوں کو ظاہر کرتے ہیں۔

شیاما پرشاد 6 جولائی 1901 کو کلکتے میں پیدا ہوئے تھے۔ علم کی بہترین روایات انہیں ورثے میں ملی تھیں۔ سرگرم قومیت اور جرات اپنے عظیم والد سے ملی تھیں۔ ان کی والدہ جگت ترانی دیوی ایک سیدھی سادی خاتون تھیں۔ انہوں نے اپنے کو شوہر، اپنے خاندان اور مذہب کے لئے وقف کردیا تھا۔

وہ اونچے برہمن اور اپنے وقت کے اعلیٰ معیار کے خاندان کے فرد ہوتے ہوئے بھوانی پور کے مکھرجی اپنی درگا پوجا، کے لئے بھی اتنے ہی مشہور تھے جتنا تہذیبی برتری کے لئے تھے۔ مکھرجی کا مکان پورے کلکتے میں تعلیمی منزل مانا جاتا تھا۔ اشوتوش مکھرجی کو کتابوں کا بہت شوق تھا۔ انہوں نے اپنا مکان ہر مضمون کی کتابوں سے بھرلیا تھا۔ ہر کمرے اور ہر برآمدے میں کتابیں سجی ہوئی تھیں۔

شیاما پرساد کی پرورش ایسے ماحول میں ہوئی۔ انہوں نے اپنے خاندان کو تعلیمی اور مذہبی دونوں روایتوں کو اپنایا۔ وہ پوجا کے جشن میں بہت دلچسپی لیتے تھے۔ روایتی رسموں، اور نظم وضبط(ڈسپلن) پر عمل انہوں نے اپنے والد سے سیکھا تھا۔

ایک خوش آیند امتزاج

ملکی اور غیر ملکی عالم مکھرجی کے مکان پر آتے رہتے تھے۔ شیاما پرساد نے ان سے قابل قدر خیالات حاصل کیے۔ اصل میں ان کا مکان اس وقت کے عالموں اور سیاسی رہنماؤں کے ملنے کی جگہ تھی۔ یہ بڑے لوگ اشوتوش مکھرجی سے ضروری حوصلہ اور رہنمائی حاصل کرتے تھے۔ جو سرائل بنگال ٹائیگر" کے نام سے مشہور تھے۔

اشوتوش مکھرجی کلکتہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر اور کلکتہ ہائی کورٹ کے جج تھے۔ اس زمانے میں یہ بڑی پوزیشن تھی۔

شیاما پرساد جس ماحول میں پلے بڑھے تھے اس نے ان کے ذہن پر گہرا اثر ڈالا تھا۔ ایک طرف تو انہوں نے ہندوستان کی نسلوں پرانی تہذیب کا اثر لیا تھا اور دوسری طرف وہ مغربی خیالات اور علم کے بہت مداح تھے جس سے اُن میں ذہنی سمجھ بوجھ پیدا ہوئی تھی۔ ان میں ہندو روحانیت، برداشت، انسانیت، سائنسی نظر اور وسیع النظری اور مغربی خیالات میں جو کچھ بھی اچھا تھا اس کا ایک خوش گوار امتزاج موجود تھا۔

اسوتوش مکھرجی کے چار لڑکے تھے۔ راما پرساد، شیاما پرساد، اوما پرساد اور بابا پرساد۔ یہ لوگ اپنے والد کی شفقت اور نگرانی میں پلے بڑھے۔ اس نگرانی میں سخت ڈسپلن اور قدیم ہندوستانی سسٹم برہمچاریہ خاص تھے۔

تعلیم

نوجوان شیاما پرساد نے مشہور ادارے مترا انسٹی ٹیوشن، کلکتہ میں تعلیم حاصل کی۔ انہوں نے میٹریکولیشن کا امتحان بہت اچھے نمبروں سے پاس کیا۔ انہیں وظیفہ ملا اور نامور پریسی ڈنسی کالج میں 1917 میں داخلہ ملا۔

وہ ذہین اور محنتی طالب علم تھے۔ وہ 1919 کے انٹر آرٹس کے یونیورسٹی امتحان میں اول آئے۔ 1921 میں انہوں نے انگلش آنرس میں بی۔ اے۔ کا امتحان بھی اول درجے (فرسٹ ڈویژن) میں اول نمبر (فرسٹ پوزیشن) کے ساتھ پاس کیا۔

اس زبردست کامیابی کے بعد انہوں نے ایک جرات مندانہ قدم اٹھایا۔ انگلش میں ایم اے کرنے کے بدلے بنگلی میں ایم۔ اے۔ کرنا طے کیا۔ اس کی وجہ ان کے والد کے خیالات کا اثر تھا۔

ان کے والد اشوتوش مکھرجی محسوس کرتے تھے کہ صرف وسیع بنیادوں پر اعلیٰ تعلیم ملک کے لوگوں میں خود اعتمادی پیدا کر سکتی ہی۔ ان کا خیال تھا کہ بنگلی اور دوسری ہندوستانی زبانیں انگریزی کے مقابلے میں دبی ہوئی ہیں۔ انہیں یونیورسٹی تعلیم میں ان کا صحیح مقام ملنا چاہیئے۔ شیاما پرساد کا بنگالی میں ایم۔ اے۔ کرنا ان کے پختہ عقیدے کا ثبوت تھا۔

ایم۔ اے۔ کی تعلیم کے دوران ہی 1922 میں ان کی سدھادیوی سے شادی ہوگئی۔

1923 میں اشوتوش مکھرجی کا انتقال ہوگیا۔ شیاما پرساد مکھرجی کے لئے یہ بڑا حادثہ تھا۔ اپنی تعلیم کے زمانے میں ہی شیاما پرساد یونیورسٹی کے کاموں میں اپنے والد کی مدد کیا کرتے تھے۔ اصل میں تعلیم کے کاموں میں یہ ان کی ابتدا تھی۔

شیاما پرساد مکھرجی اپنے والد کے تعلیمی منصوبوں اور پالیسی کے بارے میں گہری نظر رکھتے تھے۔ اس لیے یونیورسٹی کے بہی خواہوں نے یونیورسٹی انتظامیہ سے ان کو متعلق رکھنا مناسب سمجھا۔

انہوں نے 1924 میں بی۔ ایل۔ (قانون کی ڈگری) حاصل کی۔ ایک بار پھر وہ یونیورسٹی میں اول آئے۔ اسی سال وہ یونیورسٹی سینیٹ اور سنڈیکیٹ کے ممبر منتخب ہوئے۔ بعد میں شیاما پرساد مکھرجی اس کے وائس چانسلر بنے۔

لندن کے ادارے لنکن ان کی طرف سے انھیں انگلش بار میں مدعو کیا گیا۔ ان کی بیوی سدھادیوی کے چار بچے ہوئے۔ دو لڑکے دو لڑکیاں۔ 1934 میں ان کی بیوی کا انتقال ہوگیا۔ خاندان کے لوگوں اور دوستوں نے ان پر دباؤ ڈالا کہ وہ دوسری شادی کرلیں۔ لیکن شیاما پرساد اس کے لئے تیار نہ ہوئے اور اپنی باقی زندگی قومی خدمت کے لئے وقف کردی۔

بچپن ہی سے شیاما پرساد نے سادی زندگی گذاری تھی۔ انہیں وطن پرستی اور جرات خاندانی ورثے میں ملی تھی۔ پوری زندگی ان کے خیالات اونچے رہے۔ بچپن سے ہی ان کے

مشاغل میں ان خیالات کا اظہار ہوتا تھا۔

شریفانہ زندگی

پریسی ڈنسی کالج کلکتہ کی تعلیم کے زمانے میں انھیں کالج میگزین کا اڈیٹر بنایا گیا۔ اس سے انھوں نے لکھنے کی ابتدا کی۔ 2 ستمبر 1920 کو انھوں نے میگزین کے لئے لندن کے پروفیسر پرسی وال سے ایک مضمون کی درخواست کی۔ اس خط میں انھوں نے لکھا کہ دل کی گہرائیوں سے مجھے دعا دیجئے کہ میں صاف ستھری اور شریفانہ زندگی گذاروں۔ صاف ستھری اور شریفانہ زندگی، ان کا معیار تھا۔ ان کے تمام مشاغل میں ان کا یہ معیار نظر آتا ہے۔ شیاما پرساد نے اصولوں کے معاملے میں کبھی سمجھوتہ نہیں کیا۔

لکھنے کی صلاحیت میگزین کی اڈیٹری کے زمانے میں ابھری۔ اسی سے انھیں صحافت کا شوق پیدا ہوا اور کچھ عرصے اس کام میں لگے رہے۔ 1922 میں ایک بنگلی رسالہ بنگاوانی شروع کیا۔ پاٹ لووال، "کیپٹل" نام کا ایک اخبار نکالتے تھے۔ اس میں 24۔1922 کے دوران وہ ایک سلسلہ وار مضمون لکھتے رہے۔ اپنے اصلی نام سے نہیں۔ ڈِچ کے نام سے۔

شیاما پرساد مکھرجی کی زندگی میں صحافت کا بہت مختصر سا عرصہ تھا۔ بعد میں چالیس اور پچاس کے دہے کے آخری برسوں میں انھوں نے اپنا روزنامہ دی نیشنلسٹ کلکتے سے شروع کیا۔ یہ بہت کم عرصے چلا۔

سیاست میں

وطن کی محبت شیاما پرساد مکھرجی کو سیاست میں لے آئی۔ انھوں نے سیاست میں شروع ہی میں، یعنی 1929 میں حصہ لینا شروع کر دیا تھا۔ اس وقت وہ یونیورسٹی حلقے سے کانگریسی امیدوار کی حیثیت سے بنگال قانون ساز کونسل کے ممبر چنے گئے۔ اس کا قریبی تعلق تعلیمی کام سے تھا۔ امید کی جاتی تھی کہ وہ کونسل میں کلکتہ یونیورسٹی کے مسائل کے محافظ ہوں گے۔

پھر کانگریس کا پرجوش مطالبہ آیا کہ کونسلوں کا بائیکاٹ کرو۔ انھوں نے اس آواز پر

لبیک کہا اور کونسل کی سیٹ سے استعفیٰ دے دیا۔ لیکن جلدی ہی وہ ایک آزاد امیدوار کی حیثیت سے پھر کونسل کے ممبر بن گئے۔ اس سے وہ یونیورسٹی کے مسائل پر نظر رکھ سکے۔

پارلیمانی زندگی کے تجربے اور اس دور میں مسلم لیگ اور کانگریس کے کام اور طریقوں سے شیاما پرساد نے جو تجربہ حاصل کیا اس سے انہیں آئندہ چل کر اپنا سیاسی پروگرام پوری طرح سوچ سمجھ کر بنانے کا موقع ملا۔

اس وقت تک انگریزوں کی "تقسیم کرو اور حکومت کرو" کی پالیسی اپنا رنگ دکھانے لگی تھی۔ مسلمانوں کے لئے الگ جگہوں کے مطالبے کی پالیسی سے فضا فرقہ پرستی سے زہریلی ہو رہی تھی۔ انگریز اپنے مقصد میں اور آگے بڑھے اور 1932 کے فرقہ بندی اوارڈ نے تنگ نظری کو اور ہوا دی۔ اس فیصلے میں پسماندہ فرقوں کے لوگوں کے لئے قانون ساز جماعت میں جگہوں کو مقرر کر دیا گیا تاکہ ان فرقوں کی نمائندگی یقینی ہو جائے۔

1937 میں بنگال کی قانون ساز پہلی بار فرقہ واری اوارڈ کی بنیاد پر چنی گئی۔ شیاما پرساد مکھرجی پھر یونیورسٹی حلقے سے اسمبلی کے لئے چنے گئے۔ کانگریس کے 60 ممبر جیتے اور 37 آزاد امیدوار آئے۔ باقی جگہیں مسلمانوں اور انگریزوں کے بیچ بٹیں۔

کرشک پرجا پارٹی، جس کے لیڈر ایک قوم پرست مسلمان فضل الحق تھے، کانگریس کے ساتھ ملی جلی سرکار بنانا چاہتے تھے۔ شیاما پرساد مکھرجی کو یقین تھا کہ اگر کانگریس کرشک پرجا پارٹی کے ساتھ مل کر حکومت بناتی ہے تو بنگال کو ایک ایسی مستحکم حکومت مل سکتی ہے جس میں مسلم لیگ شامل نہ ہو۔ صوبائی کانگریس کا بھی یہی رویہ تھا۔

لیکن انگریز چاہتے تھے کہ مسلم لیگ کی حکومت بنے۔ بدقسمتی سے کانگریس کے لیڈر انگریزوں اور مسلم لیگ کے چکر میں آگئے۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ کرشک پرجا پارٹی کے ساتھ مل کر حکومت نہیں بنائیں گے۔ اس سے شیاما پرساد مکھرجی کو بڑی ناامیدی ہوئی۔

کرشک پرجا پارٹی نے 1937 میں مسلم لیگ اور آزاد ہندوؤں کے ساتھ مل کر حکومت بنائی۔ فضل الحق چیف منسٹر (وزیر اعلیٰ) بنے۔ اس حکومت میں شیاما پرساد مکھرجی وزیر مال بنے۔ عدم استحکام کے باوجود، جس میں شیاما پرساد مکھرجی کا استعفیٰ بھی شامل تھا، فضل الحق کی

حکومت دوسری عالمی جنگ شروع ہونے تک چلتی رہی۔ شیاما پرساد مکھرجی اور دوسرے بڑے رہنماؤں کا اندیشہ صحیح تھا۔ بنگال اور ہندوستان دونوں کے لئے اس کے نتائج بہت دور رس تھے۔

اتحاد کی بصیرت

جب شیاما پرساد مکھرجی کانگریس کی پالیسیوں سے مطمئن نہ رہے تو ان کے اندر کے وطن پرست نے کسی ایسی پارٹی کی تلاش شروع کی جو متحدہ ہندوستان کے فائدوں کو ہمیشہ ایجنڈا میں شامل رکھے۔

اس موقع پر وہ ویر ساورکر کے گہرے اثر میں آئے۔ ویر ساورکر 1937 میں جیل سے چھوٹے تو انھوں نے کانگریس کے عہدے اور طاقت کی پیش کش کو ٹھکرا دیا اور ہندو مہاسبھا میں نئی روح پھونکی۔ ویر ساورکر کی پرجوش قوم پرستی، وطن پرستی اور حقیقت پسندی میں کانگریس کے مقابلے میں انہیں بہتری نظر آئی۔ کانگریس کی پالیسیاں انہیں کمزور محسوس ہوئیں۔ اور مکھرجی ہندو مہاسبھا میں شامل ہوگئے اور 1937 ہی میں اس کے کارگزار صدر بن گئے۔

اس موقع پر شیاما پرساد مکھرجی گاندھی جی سے ملنے گئے۔ کسی نے گاندھی جی سے کہا کہ شیاما پرساد مکھرجی ہندو مہاسبھا میں چلے گئے ہیں۔ یہ سن کر گاندھی جی نے کہا "اس کی ضرورت تھی کہ مدن موہن مالویہ کے بعد کوئی تو ہندوؤں کی رہنمائی کرے۔"

اس پر شیاما پرساد مکھرجی نے کہا۔ "لیکن پھر آپ مجھے فرقہ پرست کہنے لگیں گے۔"

گاندھی جی نے جواب دیا "شیوجی کی طرح جس نے سمندر کو بلونے کے بعد زہر پی لیا تھا۔ کوئی تو ہو جو ہندوستانی سیاست کا زہر پیے۔ شاید وہ تم ہی ہو۔"

گاندھی جی شیاما پرساد مکھرجی کے وسیع قومی نظریے اور خیالات سے بہت متاثر ہوئے۔ جب شیاما پرساد گاندھی جی کے پاس سے چلنے لگے تو گاندھی جی نے کہا۔ "سردار پٹیل ہندو ذہن کے ساتھ کانگریس میں ہیں۔ آپ کانگریسی ذہن کے ساتھ ہندو مہاسبھائی بنیں۔"

1942 میں شیاما پرساد مکھرجی بنگال کابینہ میں شامل ہوئے۔ اس زمانے میں گاندھی جی نے "ہندوستان چھوڑو" کا نعرہ دیا۔ انگریز حکومت نے ہندوستان میں دہشت کا ماحول پیدا کر دیا۔ جاپانی فوجیں برما میں بڑھ رہی تھیں۔ سبھاش چندر بوس کی پرجوش قیادت میں انڈین نیشنل آرمی کی کارگزاریاں ہندوستانی حالات کو نیا رخ دے رہی تھیں۔

سیاسی اور فوجی حالت بہت نازک ہوگئی تھی۔ انگریزوں نے ہندوستان کے مشرقی حصے میں سب کچھ پھونک دو کی پالیسی پر عمل شروع کر دیا تھا۔ پالیسی یہ تھی کہ جب فوجیں میدان جنگ سے پسپا ہوں تو سارا ساز و سامان اور ذرائع کو ختم کرتی چلی جائیں۔

کانگریسی لیڈر جیل میں تھے۔ انگریزوں کے خلاف قوم کی طرف سے آواز اٹھانے والا کوئی نہ تھا۔ شیاما پرساد مکھرجی گو کہ حکومت کے رکن تھے لیکن انہوں نے قوم کی طرف سے آواز اٹھانے کا فیصلہ کیا۔ انہوں نے وائسرائے لارڈ لنلتھگو سے خط و کتابت شروع کی۔ انہوں نے مطالبہ کیا کہ لیڈروں کو چھوڑ دیا جائے۔ انہوں نے کہا کہ عوام پر بھروسہ کرو اور انہیں غیر ملکی حملے کے خلاف ڈیفنس فنڈ جمع کرنے کی اجازت دو۔ جب ان کی بات نہ مانی گئی تو انہوں نے کابینہ سے استعفیٰ دینے اور قومی تحریک کی رہنمائی کرنے کا فیصلہ کیا۔

بنگال کا قحط

انگریزی حکومت کی "سرزمین جھلسنے" کی پالیسی اور مشرقی بنگال کے دریاؤں سے کشتی رانی ختم کر دینے سے سامان کے آنے جانے کا سلسلہ ختم ہوگیا چونکہ کشتی رانی ہی اس کا ایک واحد ذریعہ تھا۔ آنے جانے کا ذریعہ ختم ہوا تو بہت سا اناج ضائع ہوا۔

1943 کا قحط حکومت کی پالیسی کا نتیجہ تھا۔ اس سے انسان دوست شیاما پرساد مکھرجی کو بہت تکلیف ہوئی۔ انہوں نے لوگوں کی پریشانیاں، اور بھوک سے مرتے ہوئے لوگ دیکھے تو وہ خاموش تماشائی نہ رہ سکے۔

شیاما پرساد مکھرجی نے بڑے پیمانے پر امدادی کام کو منظم کرنا شروع کیا۔ انہوں نے ہندوستان کے عوام سے امدادی کام میں حصہ لینے کی اپیل کی۔ پورے ملک نے ان کی اپیل کا

بہت اچھا جواب دیا۔ صرف بنگال کی ریلیف کمیٹی کو 27.55.000 سے زیادہ نقد اور بہت سا سامان وصول ہوا۔ اس سامان میں کپڑے اور غلہ وغیرہ بھی شامل تھا، جس کی قیمت اندازاً دس لاکھ روپیے تھی۔ ہندو مہا سبھا کی کمیٹی کو ساڑھے آٹھ لاکھ روپیے اور ہزاروں من غلہ وصول ہوا۔

شیاما پرساد مکھرجی کی اس عظیم کوشش کے باوجود قحط سے تقریباً 30 لاکھ آدمی مرے۔

شیاما پرساد مکھرجی نے بنگال کے بہت سے امدادی مرکزوں کا دورہ کیا تاکہ غلے، کپڑے اور دواؤں کی صحیح تقسیم سے انسانوں کی تکلیف میں کمی ہو۔ ان کی انتھک کوشش کی وجہ سے لاکھوں لوگ موت سے بچ سکے۔

جب اس علاقے پر سے قحط کا منحوس سایہ ختم ہوا تو اسے اس سے بھی زیادہ تاریک سائے نے گھیر لیا۔ یہ تاریک سایہ تھا ملک کی تقسیم کا۔ جو فرقہ وارانہ بنیادوں پر عمل میں آئی تھی۔

مسلم لیگ کی انگریزی حکومت نے حمایت کی تھی، ان کی ہمت افزائی کی تھی۔ اس نے اپنے لیے علیحدہ ملک کا مطالبہ کیا۔ یہ محسوس کرکے کہ انڈین نیشنل کانگریس انہیں خوش کرنے کی کوشش کرتی ہے مسلم لیگ نے پاکستان کا مطالبہ کیا اور کوشش کی کہ انگریزوں کے جانے سے پہلے ہی ملک تقسیم ہو جائے۔

تقسیم کی مخالفت

شیاما پرساد مکھرجی نے ہندوستان کی تقسیم کے خلاف ایک ملک گیر تحریک شروع کی۔ لیکن یہ وطن پرست بے بس ہوگیا جب برٹش کیبنٹ مشن (1946) نے تقسیم کے خلاف ان کی دلیلوں کے جواب میں کانگریس ورکنگ کمیٹی کی تجویز دکھائی جس میں کہا گیا تھا کہ ہم کسی حصے کو زبردستی ہندوستان میں رکھنا نہیں چاہتے جو ساتھ رہنا نہ چاہتا ہو۔

یہ ان کے لئے غیر متوقع جھٹکا تھا۔ 1946 کے الیکشن میں شیاما پرساد مکھرجی نے سردار ولبھ بھائی پٹیل کی اس یقین دہانی پر کانگریس کی مدد کی تھی کہ کانگریس ملک کی تقسیم کو کبھی منظور نہ کرے گی۔ انہیں اس وقت تک یہ معلوم نہ تھا کہ کانگریس ورکنگ کمیٹی یہ بات مان چکی تھی کہ مسلم اکثریت کے صوبے ہندوستان سے الگ ہو سکتے ہیں۔

اس کے بعد انہوں نے اپنی پوری طاقت اس پر لگادی کہ پاکستان کو کم سے کم علاقہ ملے۔ اگر مسلم لیگ کو انگریزوں کے ساتھ مل کر اپنا منصوبہ مکمل طور پر پورا کرنے کا موقع مل جاتا تو تباہی اور بھی زیادہ شدید ہوتی۔

بنیادی طور پر یہ شیاما پرساد مکھرجی کی کوششوں کا ہی نتیجہ تھا کہ آدھا پنجاب اور آدھا بنگال ہندوستان کے ساتھ باقی رہ گیا۔ ان کا مشہور قول اس کوشش کی وضاحت کرتا ہے، "کانگریس نے ہندوستان کو تقسیم کیا اور میں نے پاکستان کو تقسیم کیا۔"

15 اگست 1947 کو یونین جیک سنٹرل سکریٹریٹ سے اتر گیا اور ہندوستان کے قومی جھنڈے نے فخر کے ساتھ اس کی جگہ لی۔

شیاما پرساد مکھرجی کو گاندھی جی کی طرف سے پیش کش ملی کہ وہ پہلی ہندوستانی قومی حکومت میں شریک ہوں۔ انہوں نے اس امید پر یہ دعوت قبول کرلی کہ وہ آزاد ہندوستان کی پالیسی کو متاثر کر سکیں گے اور ان لاکھوں ہندوؤں کے مفاد کا تحفظ کر سکیں گے جو پاکستان میں رہ گئے تھے۔

صنعت کے مرکزی وزیر کی حیثیت سے شیاما پرساد مکھرجی کی کارگزاری بہت اچھی رہی۔ انہوں نے ہندوستان کی صنعتی ترقی کی بنیادوں کو مضبوط بنایا۔ دوسرے بڑے پروجکٹ بھی شروع کئے جن میں 1950 میں چترنجن لوکو موٹیو ورک (ریلوے انجن بنانے کا کارخانہ) اور 1951 میں سندری کھاد کی فیکٹری شامل ہیں۔

شرنارتھی

تقسیم کے بعد مشرقی پاکستان کے ہندو مجبور کردیے گئے کہ وہ وہاں سے نکل جائیں۔ اس کے لئے وہاں خوف ودہشت کا ماحول پیدا کردیا گیا۔ اس کے نتیجے میں بھوکے اور ٹوٹی پھوٹی حالت میں شرنارتھی بڑی تعداد میں کلکتے میں آنے شروع ہوئے۔ وہ اپنے ساتھ پریشانیوں اور تکلیف دہ واقعات کی یادوں کے علاوہ اور کچھ نہ لاسکے تھے۔

شیاما پرساد مکھرجی ان حالات سے بہت پریشان ہوئے۔ ان کا خیال تھا کہ حکومت ہند کو

ان شدید حالات پر پوری توجہ دینی چاہیئے۔ انہوں نے حکومت ہند پر ہر ممکن دباؤ ڈالا کہ دونوں ملکوں کے بیچ پاس پورٹ سسٹم شروع نہ ہو اور پاکستان کے ساتھ ایسا برتاؤ کیا جائے کہ وہ بھی انسانی قدروں کا تحفظ کرے۔ انہوں نے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو سے اپیل کی کہ وہ مغربی بنگال آئیں اور مشرقی پاکستان سے ہزاروں کی تعداد میں آئے ہوئے لوگوں کی وجہ سے پیدا ہوئے حالات کو خود دیکھیں۔

پنڈت نہرو 18۔19 اکتوبر 1952 کو آسام جاتے ہوئے کلکتے میں رکے۔ شیاما پرساد مکھرجی نے حالات کے تنقیدی جائزے کے ساتھ ایک میمورنڈم پیش کیا۔ انہوں نے تجویز کیا کہ مشرقی بنگال کے ہندوؤں کے مسئلے کو حل کرنے کے لئے موثر اقدام کی ضرورت ہے۔ انہوں نے محسوس کیا کہ ان کی دلیلوں اور اپیلوں پر کوئی توجہ نہ دی گئی۔

مخالف پارٹی میں

پالیسی کے وسیع تر معاملوں، خاص طور پر پاکستان کے مسئلے پر، ان کے اختلافات جلد ہی سامنے آگئے۔ نہرو۔لیاقت معاہدے کے ہوتے ہی 1950 میں یہ اختلافات عروج پر پہنچ گئے۔

معاہدے پر دستخط ہونے سے روکنے میں شیاما پرساد مکھرجی ناکام ہوگئے تو انہوں نے حکومت سے استعفےٰ دینے کا فیصلہ کیا، اور حکومت کی پالیسی پر باہر سے مخالفت شروع کی۔ شیاما پرساد مکھرجی پارلیمنٹ اور کانسٹی ٹیوئنٹ اسمبلی (قانون ساز اسمبلی) کے پہلے رکن تھے جو مخالف پارٹی میں بیٹھے۔

اس مدبر کی دور بینی 19 اپریل 1950 کے ان کے استعفےٰ میں بیان کردہ خیال سے ظاہر ہوتی ہے۔ وہ ایک طرح سے غیبی خیال تھا۔ انہوں نے ہندوپاک تعلقات پر حقیقت پسندانہ اظہار خیال کیا تھا۔ انہوں نے معاہدے کے ناکام ہونے کی پیش گوئی کے طور پر دلائل پیش کیے تھے اور کہا تھا کہ اس سے کوئی مسئلہ حل نہیں ہوگا۔ یہ خیال آج بھی اتنا ہی صحیح ہے جتنا تقسیم کے وقت صحیح تھا۔

شیاما پرساد مکھرجی ہندو مہا سبھا کے ممبر بن گئے تھے لیکن وہ کبھی بھی تنگ نظری اور

فرقہ پرستی کے شکار نہ ہوئے۔ انھوں نے اپنی وطن پرستی اور آزاد خیالی کی وجہ سے ہندو مہاسبھا میں بلاتفریق مذہب ونسل تمام ہندوستانیوں کے داخلے کی تجویز کی لیکن مہاسبھا نے ان کی تجویز کو نامنظور کر دیا۔

اس پر شیاما پرساد مکھرجی نے بھارتیہ جن سنگھ کی بنیاد ڈالی۔ اکتوبر 1951 میں وہ اس کے قایم کرنے والے صدر بنے۔ اور اس پارٹی کو قوم پرست اور جمہوری پارٹی کی حیثیت سے موجودہ حکومت کرنے والی پارٹی، (کانگریس) کا متبادل بنانے کی کوششوں میں لگ گئے۔

1912 کے پہلے عام انتخاب میں شیاما پرساد مکھرجی شمالی کلکتے سے پارلمنٹ کے ممبر منتخب ہوئے۔ جن سنگھ کے دو اور ممبر جیتے تھے۔ لیکن چھوٹی پارٹیوں۔۔ جن میں اڑیسہ کی گن تنتر پریشد، پنجاب کا اکالی دل، ہندو مہا سبھا اور کئی آزاد ممبروں کو ملا کر ایک قومی جمہوری محاذ بنایا گیا اور شیاما پرساد مکھرجی اس کے لیڈر چنے گئے۔

اس سے وہ پارلیمنٹ میں مخالف پارٹی کے لیڈر بن گئے۔ پارلیمنٹ میں ان کا رویہ بالکل جدا تھا۔ انھیں شیر پارلیمنٹ کا خطاب ملا۔ اب تک پارلیمنٹ میں مخالف پارٹی کا کوئی لیڈر ان جیسا کام نہ کر سکا۔

کشمیر کا مسئلہ

کشمیر میں رفتہ رفتہ تناؤ کی کیفیت پیدا ہو رہی تھی۔ کیوں کہ علیحدگی پسندوں کو پاکستان نوازوں کی مدد مل رہی تھی۔ شیاما پرساد مکھرجی کی توجہ جموں اور کشمیر کے مسئلے کی طرف زیادہ سے زیادہ مرکوز ہوتی گئی۔ وہ شیخ عبداللہ کے رویے اور ان کے کچھ بیانات کی وجہ سے چونک گئے اور جموں اور کشمیر کی پرجا پریشد کا معاملہ ہاتھ میں لینے کا فیصلہ کیا۔

پریشد مطالبہ کر رہی تھی کہ جموں اور کشمیر ریاست کو پوری طرح ہندوستان میں ملایا جائے۔ اس کی پوزیشن بھی دوسری ریاستوں کی طرح ہو۔ قومی جھنڈا ایک ہو، دستور ایک ہو، جموں اور کشمیر ریاست کی انتظامیہ کا سربراہ دوسری ریاستوں کی طرح وزیر اعلیٰ کہلائے۔

شیاما پرساد مکھرجی اگست 1952 میں کشمیر گئے۔ انسانوں کے ٹھاٹھیں مارتے سمندر سے

خطاب کرتے ہوئے انہوں نے کہا۔ "میں تمہیں ہندوستان کا دستور دوں گا یا اس کوشش میں اپنی جان دے دوں گا۔" ان کے الفاظ صحیح ثابت ہوئے۔ جب مئی 1953 میں انہوں نے پھر جموں جانے کا فیصلہ کیا، تاکہ وہ موقع پر ان حالات کا مشاہدہ کرسکیں جو شیخ عبداللہ کے جموں مخالف رویے سے پیدا ہوئے تھے، تو حکومت ہند نے پہلے تو یہ فیصلہ کیا کہ انہیں پنجاب میں گرداس پور میں گرفتار کرلیا جائے، لیکن بعد میں یہ خیال بدل دیا اور انہیں کشمیر میں داخلے کی اجازت دے دی گئی۔

شیاما پرساد مکھرجی گرفتار کرلئے گئے۔ قید کی حالت میں 23 جون 1953 کو سری نگر میں ان کا انتقال ہوگیا۔

مہاتما گاندھی کی شہادت جو پوری انسانیت کا المیہ تھا، اور وہ قتل اور تباہی جو آزادی کے ساتھ آئی تھی، تقسیم ہند کے نتائج اب کھل کر سامنے آرہے تھے۔

ہریندر ناتھ چٹوپادھیائے نے ایک یادگار نظم میں شیاما پرساد مکھرجی کو خراج عقیدت پیش کیا۔

"ایک عظیم شخصیت چلی گئی۔ شاندار ذہانت کا سورج غروب ہوگیا۔
عظیم شخصیتیں ایک ایک کرکے رخصت ہو رہی ہیں۔
ہماری غمزدہ قوم جن کے احسان میں دبی ہوئی ہے۔"

قوم پرستی

شیاما پرساد مکھرجی ایک چوکنا اور تنقیدی ذہن رکھتے تھے۔ وہ بہت ذہین تھے۔ فطرتاً خوش مزاج تھے۔ بچپن ہی سے انہوں نے زندگی میں سادگی لیکن خیالات میں بلندی سیکھی تھی۔ وہ شروع ہی سے سخت محنت کے عادی تھے۔ اس کی پرواہ کئے بغیر کہ وہ کہاں ہیں صبح کو پانچ بجے کے قریب اٹھ جاتے تھے۔ تقریباً ڈیڑھ گھنٹے میں ضروریات سے فارغ ہوکر کام کے لئے تیار ہوجاتے تھے۔ وہ عام طور پر رات کو دس بجے تک کام کرتے تھے۔

شیاما پرساد مکھرجی دل سے قوم پرست (نیشنلسٹ) تھے۔ "ملک پہلے ہے۔" ان کا قول تھا۔

وہ پاکستان کے ساتھ برابری کے ساتھ لین دین کی پالیسی پر یقین رکھتے تھے۔ وہ جنوب مشرقی ایشیا کے ممالک کے ساتھ قریبی سماجی اور معاشی تعلقات کے قائل تھے۔ اور دوسرے ممالک کے ساتھ آپسی مفاد کی بنیاد پر دوطرفہ تعلقات کو پسند کرتے تھے۔

شیاما پرساد مکھرجی کھلے بازار کی معیشت (مارکٹ اکانومی) کو پسند کرتے تھے لیکن خاص حالات میں حکومت کی معیشت میں دخل اندازی کے بھی خلاف نہ تھے۔

آزاد ہندوستان کی تعلیمی پالیسی کے سلسلے میں وہ چاہتے تھے کہ پورے تعلیمی نظام کو نئے سرے سے ترتیب دیا جائے اور اس کی بنیاد پیشہ ورانہ (ووکیشنل) ہو۔ نصاب میں اخلاقیات کی تعلیم اور قومی مسائل ضرور ہوں۔ وہ سرکاری زبان کے زبردست حمایتی تھے۔ سیاست انھیں ملک کی سماجی اور تعلیمی زندگی سے الگ نہ کر سکی۔

مہابودھی سوسائٹی کے صدر کی حیثیت سے وہ ہندوستان اور بدھ دنیا کے بیچ ایک رشتہ تھے۔ انھوں نے 1952 میں "سری پتا" اور "سہاسگالانا" کی باقیات کے ساتھ برما اور کمبوڈیا کا سفر کیا تھا۔ یہ ان ممالک سے تہذیبی رشتوں کو جوڑنے اور مضبوط کرنے کی کوشش تھی۔

ان کی موت نے پورے ملک کی اور خاص طور پر بنگال کی سیاست میں ایک خلا پیدا کر دیا۔

ہومی جہانگیر بھابھا

راجی این۔ کمار

"یہ بات پوری طرح ہندوستان کے مفاد میں ہے کہ بنیادی فزکس کا ایک پوری قوت کے ساتھ کام کرنے والا تحقیقی ادارہ شروع کیا جائے۔ اس ادارے میں صرف فزکس کی کم ترقی یافتہ شاخوں پر تحقیق ہی نہیں ہوگی ملکی صنعت میں فوری عملی مسائل کو حل کرنے کی کوشش بھی کی جائے گی۔ اس کے علاوہ جب اب سے کچھ دہائیوں بعد۔۔۔ نیوکلیائی قوت کو کامیابی کے ساتھ بجلی بنانے میں استعمال کیا جائے گا تو ہندوستان سے باہر سے ماہرین کے بلانے کی ضرورت نہ رہے گی بلکہ وہ یہیں موجود ہوں گے۔ میں نہیں سمجھتا کہ ہندوستان سے باہر بھی کوئی آدمی جو سائنسی ترقی سے واقف ہے ہندوستان میں ایسے ادارے کی ضرورت سے انکار کرے گا۔"

ہومی جہانگیر بھابھا

ہومی جہانگیر بھابھا

جنوری 1955 میں مانٹ بلینک پر ہوائی جہاز کے تباہ کن حادثے میں اپنے زمانے کے ممتاز افراد میں سے ایک اس دنیا سے چلا گیا۔ اس نے ہندوستان میں سائنس کی ترقی کے لیے زبردست کام کیا تھا۔ اس نے ہندوستان کو ایٹمی قوت والے ملکوں میں شامل کر دیا۔ وہ ہی ملک میں نیوکلیائی میدان میں شاندار ترقی کا معمار تھا۔ انسانی ترقی ہمیشہ کچھ ہی افراد کی بہترین صلاحیتوں اور تخلیقی کام پر منحصر رہی ہے۔ اور ہومی بھابھا ان ہی لوگوں میں سے ایک تھے۔

ہومی بھابھا نے اپنی خوشی سے سائنس کو ترقی دینے کا مشکل کام اپنے ہاتھ میں لیا۔ بھابھا کی نظر میں تیزی سے ترقی کرتی معیشت اور نیوکلیائی توانائی دونوں ساتھ ساتھ ملک کی ترقی کے لیے ضروری تھیں۔ انہوں نے 1944 میں ہی مستقبل میں جھانک لیا تھا کہ نیوکلیائی توانائی، بجلی تیار کرنے میں کام آجائے تو ہندوستان تکنیکی جانکاری کے لیے مغربی ممالک کا محتاج نہ رہے گا۔ ہومی بھابھا نے اکیلے ہی صرف بیس سال کے مختصر عرصے میں اپنے نظریاتی خیال کو حقیقت میں تبدیل کر دیا۔

بچپن

ہومی جہانگیر بھابھا 30 اکتوبر 1909 کو پیدا ہوئے تھے۔ ان کے والد کا نام جہانگیر ہرمزجی بھابھا تھا اور والدہ کا نام مہربائی فرمی پانڈے تھا۔ وہ سر دنشا مانک جی پانڈے کی پوتی تھیں۔

ہومی بھابھا کے والد نے آکسفورڈ میں تعلیم پائی تھی۔ بعد میں وہ ایک وکیل بنے۔ جہانگیر ہرمزجی بھابھا نے میسور ریاست میں منصف کی حیثیت سے کام شروع کیا۔ شادی کے بعد وہ بمبئی چلے گئے۔ جہاں وہ ٹاٹا صنعتی کمپنیوں سے متعلق رہے۔ یہیں ہومی بچے سے بڑے ہوئے۔

ہومی بھابھا کا خاندان برسوں تعلیم اور ملک کی خدمت کے کاموں میں لگا رہا۔ ہومی بھابھا نے اپنے خاندان والوں یا دوستوں کو جو خط لکھے ہیں ان میں اور بات چیت میں بھی انہوں نے احسان مندی کے احساس کے ساتھ خاندان میں آپسی تعلقات، میل جول اور پیار محبت کا ذکر کیا ہے۔ اس کی وجہ سے بچپن اور نوجوانی میں ان میں جذباتی تحفظ کا احساس رہا۔

ان کے دادا ہرمزجی بھابھا۔ جن کے نام پر ان کا نام رکھا گیا تھا۔ ریاست میسور سے آئے تھے جہاں تعلیم کے انسپکٹر جنرل کی حیثیت سے ان کی بہت عزت تھی۔ بمبئی میں نوجوان ہومی کو اپنے دادا کی لائبریری میں کتابیں پڑھنے کی اجازت تھی۔ ان کی والدہ پیٹٹ کے تاجر خاندان سے تھیں۔ یہ خاندان بھی بمبئی میں بہت باعزت مانا جاتا تھا اور خدمت خلق کے کاموں پر خرچ کرنے کے لیے مشہور تھا۔

ہومی بھابھا اپنی عمر کے بچوں کے مقابلے میں بہت کم سوتے تھے۔ ان کے والدین ان کی نیند کی کمی سے بہت پریشان رہتے تھے۔ انہوں نے بہت سے ڈاکٹروں کو دکھایا لیکن یہ پتہ نہ چلا کہ نیند کی کمی کس وجہ سے تھی۔ آخر میں یوروپین ڈاکٹروں نے بتایا کہ کوئی گڑبڑ نہیں ہے۔ ان کے کم سونے کی وجہ یہ تھی کہ ان کا دماغ بہت مصروف رہتا تھا یعنی وہ بہت سوچا کرتے تھے۔ ہومی بھابھا کو کھیل کود کا شوق نہ تھا۔ لیکن پڑھنے میں وہ بہت تیز تھے۔ بہت سے انعامات حاصل کرکے وہ کافی مشہور ہوگئے تھے۔ انہیں موسیقی کا بھی شوق تھا۔ ایک بار بچپن میں انہوں نے زور زور سے رونا شروع کردیا۔ ان کی ماں نے مختلف طریقوں سے انہیں چپ کرنے کی کوشش کی، لیکن ہومی نے رونا اور چیخنا بند نہ کیا۔ اسی وقت برابر کے کمرے سے گراموفون پر گانے کی آواز بلند ہوئی۔ اور فوراً ہی بچہ خاموش ہوگیا اور کان لگا کر موسیقی سننے لگا۔ آگے چل کر ہومی کی والدہ، ہومی کی موسیقی کے شوق کو، ان کا رونا اور چیخنا ختم کرنے کے لیے استعمال کرتی تھیں۔

ہومی بھابھا کو سیکانو۔ کھیل بہت پسند تھا۔ یہ کھیل ان کی صلاحیتوں کا امتحان تھا۔ اس میں انجنیرنگ اور مختلف چیزیں بنانے کی صلاحیت ضروری ہوتی ہے۔ وہ پڑھنے کے بھی بہت شوقین تھے اور اس شوق میں ان کے والد کی مختلف موضوعات پر جمع کتابیں مدد کرتی تھیں۔ خاص طور پر پر آرٹ اور موسیقی کی کتابیں۔ ہومی کو بہت چھوٹی عمر سے سائنس سے دلچسپی تھی۔ ان کے والدین سائنس پر اچھی کتابیں دے کر ان کی ہمت افزائی کرتے تھے۔ سولہ سال کی عمر میں ہومی اضافی حرکت کے نظریے (Theory of Ralativity) کا مطالعہ کر چکے تھے۔

ہومی بھابھا کی پھوپھی مہربائی کی شادی جمشید جی ٹاٹا کے لڑکے دوراب ٹاٹا سے ہوئی تھی۔ جمشید پور کا شہر ان ہی جمشید ٹاٹا کے نام پر ہے۔ بچپن میں ہومی بلا ناغہ سڑک پار جے این ٹاٹا کے بنائے آبائی مکان میں دوپہر کے کھانے کے لیے جایا کرتے تھے۔ وہاں وہ خاندان کے بڑے لوگوں کی بات چیت سنتے تھے۔ اس میں صنعتی ترقی کے بنیادی پروجیکٹ، جیسے لوہے کی صنعت، پن بجلی بنانے اور کیماوی چیزیں تیار کرنے کے منصوبے بھی شامل ہوتے تھے۔

ہومی بھابھا کا خاندان پوری شدت کے ساتھ قوم پرست تھا۔ گاندھی جی بمبئی میں ہومی کی خالہ کے گھر اکثر آتے تھے۔ اس زمانے میں جب انہوں نے سول نافرمانی کی پہلی تحریک شروع کی تھی تو ہومی، مختلف مسائل پر گاندھی جی کے خیالات بھی سنا کرتے تھے۔ نہرو خاندان کے ساتھ بھی ٹاٹا اور بھابھا خاندانوں کے تعلقات تھے۔ حقیقتاً بعد میں ہندوستان کے پہلے وزیر اعظم کی ہمت افزائی اور مدد کی وجہ سے ہی بھابھا اور ہندوستان، پندرہ برس کے مختصر وقت میں ایٹمی قوت کے پر امن استعمال میں غیر معمولی کامیابی حاصل کر سکے۔

تعلیم

ہومی بھابھا نے شروع میں جون کینن اسکول میں اور پھر کیتھیڈرل ہائی اسکول میں تعلیم حاصل کی۔ اور سینیر کیمبرج امتحان بہت اچھے نمبروں میں پاس کیا۔

جب وہ پندرہ سال کے تھے تو بمبئی کے ایلفنسٹن کالج میں داخل ہوئے۔ بعد میں انہوں نے رائل انسٹی ٹیوٹ آف سائنس میں داخلہ لیا۔ اٹھارہ سال کی عمر میں ان کے والدین نے انہیں اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلینڈ بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ وہ انہیں انجینرنگ کی تعلیم دلانا چاہتے تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ تعلیم سے فارغ ہوکر وہ ٹاٹا آئرن اینڈ اسٹیل کمپنی جمشید پور میں کام کریں۔ اس طرح ہومی 1927 میں کیمبرج کے گان وِلے اینڈ سائنس کالج میں داخل ہوئے۔ یہ موقع انہیں دوراب ٹاٹا کی مدد سے حاصل ہوا۔ انہوں نے بھی انیسویں صدی کے آخری دہے میں اسی کالج میں تعلیم حاصل کی تھی۔ دوراب ٹاٹا نے 1920 میں کالج کو 25,000 پونڈ کا عطیہ بھی دیا تھا۔ ہومی 30۔1929 میں کالج کے طالب علم تھے۔

جب ہومی بھابھا سائنس کالج میں انجینرنگ کی تعلیم حاصل کر رہے تھے تو انہوں نے اپنا مضمون بدل کر میتھمیٹکس (ریاضی) لینا چاہا۔ ان کے والد نے ان سے کورس مکمل کرنے کے لیے کہا۔ انہوں نے اپنے بیٹے سے وعدہ کیا کہ اگر وہ فرسٹ ڈویژن میں پاس ہوگئے تو ریاضی میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے بھی وہ اخراجات برداشت کریں گے۔

جون 1930 میں ہومی بھابھا نے کیمبرج یونیورسٹی سے میکینکل سائنس میں اعزاز کے ساتھ ڈگری لی۔ اور پھر تحقیق کے لیے نظریاتی یا تھیورٹیکل فزکس میں کام شروع کیا۔ انہوں نے 1931 میں کیونڈش لیبوریٹری میں کام شروع کیا۔ چونکہ انہیں سفری فیلوشپ ملی تھی اس لیے انہیں بہت ذہین لوگوں کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا جیسے زیورخ میں پالی، روم میں فرامی، اور اتریچ میں رامرس (Kramers)۔ 1934 میں انہیں آئزک نیوٹن اسٹوڈنٹ شپ کے لیے چنا گیا۔ اور یہ یورپ میں سب ہی نظریاتی فزکس کے اداروں والے بڑے بڑے شہروں میں گئے۔ 1935 میں انہوں نے کیمبرج سے پی۔ ایچ۔ ڈی۔ کی ڈگری لی۔ انہوں نے کوپن ہیگن میں جو نظریاتی فزکس کا مکہ کہلاتا ہے، نیلس بوہر انسٹی ٹیوٹ (Niels Boher Institute) میں بھی تعلیم حاصل کی۔

میسور میں جے۔ این۔ ٹاٹا نے ہندوستان کا پہلا تکنیکی ادارہ قائم کیا۔ "بنگلور انسٹی ٹیوٹ آف سائنس" جس کا بعد میں نام بدل کر "انڈین انسٹی ٹیوٹ آف سائنس" رکھا گیا۔

سائنس داں

ستمبر 1939 میں دوسری عالمی جنگ شروع ہوگئی۔ اس وقت ہومی بھابھا مختصر چھٹی پر ہندوستان میں تھے۔ لیکن جنگ نے ان کا منصوبہ بدل دیا۔ یورپ میں ہٹلر کے حملوں کی وجہ سے وہ ریسرچ جاری رکھنے کے لیے انگلینڈ نہ جاسکے۔ خیال تھا کہ اس زمانے میں انگلینڈ پر حملہ لازمی ہوگا۔ وہ ہندوستان میں رک گئے۔ اور انڈین انسٹی ٹیوٹ آف سائنس، بنگلور میں فزکس کے شعبے میں ریڈر کی جگہ قبول کرلی۔ 1942 میں وہ پروفیسر ہوگئے۔

جو سال انھوں نے بنگلور میں گذارے وہ ان کے لیے فیصلہ کن تھے۔ مسٹر ایم۔ جی۔ کے۔ مینن جو بہت دن بعد ان کی جگہ ٹاٹا انسٹی ٹیوٹ آف فنڈمنٹل ریسرچ، کے ڈائرکٹر بنے ۔ان کا کہنا تھا کہ یہ زمانہ وہ تھا "جب انھوں نے اپنی زندگی کا مقصد پایا، جب انھیں یہ معلوم ہوا کہ ہندوستان کی ترقی میں ان کی کیا ذمہ داری ہے۔"

ہومی بھابھا نے شروع زمانہ میں ہی کوانٹم میکانیات (quantum theory) اور کائناتی شعاعوں (cosmic radiation) میں مہارت حاصل کرلی تھی۔ کوانٹم تھیوری ہمیں نہایت چھوٹے ذرات مثلاً ایٹم کی بناوٹ اور اس کی حرکات سے روشناس کراتی ہے۔ کائناتی شعاعیں (کاسمک ریڈی ایشن) وہ زیادہ انرجی والی شعاعیں ہیں جو زمین سے بہت دور خلا سے ہمارے پاس آتی ہیں۔ ان میں زیادہ تر پروٹان اور کچھ الفا ذرات ہوتے ہیں جن کو ابتدائی شعاعیں کہا جاتا ہے، اور یہ ہماری زمین کے چاروں طرف ہوا کے غلاف سے ٹکراکر اندر داخل ہوتی ہیں تو ہوا کے مالیکیول سے ٹکراکر مزید بنیادی ذرات پیدا کرتی ہیں۔ اس طرح سمندر کی سطح پر ایک سینٹی میٹر لمبے اور چوڑے رقبہ کے اندر ہر منٹ کوئی نہ کوئی ایک بنیادی ذرہ خلا سے آکر ٹکراتا ہے۔ کائناتی شعاعیں کہاں سے آتی ہیں اور کس طرح پیدا ہوتی ہیں اس کے بارے میں ابھی کھوج جاری ہے اور خیال یہ ہے کہ غالباً یہ ان پھٹنے والے ستاروں سے آتی ہیں جنھیں سپرنووا (Super Nova) کہتے ہیں اور جو اپنی زندگی کی آخری منزل میں ہوتے ہیں۔

ہومی بھابھا اپنی صلاحیت اور تحقیقات کی وجہ سے دنیا کے ان مشہور سائنسدانوں میں

گنے جانے لگے تھے جن کو نیوکلیائی اور دیگر سائنسی علوم میں مہارت حاصل تھی۔ ہومی بھابھا کی ریسرچ کے شروع کے سال وہ ہی سال تھے جب کیونڈش تجربہ گاہ میں یکے بعد دیگرے چیڈوک کی کی ہوئی نیوٹران کی کھوج (1932)، کاکرافٹ اور والٹن کے ذریعہ زیادہ انرجی والے پروٹان کو ہلکے ایلیمنٹس (elements) سے ٹکرا کر ان میں بنیادی تبدیلی کر پانا، اور بلیکٹ اور آکسیالی نی کا زیادہ انرجی والی گاما شعاعوں سے الکٹران اور پازیٹران جوڑا بنا پانا وغیرہ ممکن ہوا۔

بھابھا نے اپنا پہلا سائنسی مضمون اکتوبر 1933 میں چھپوایا۔ اس میں انہوں نے کائناتی شعاعوں کے جذب ہونے میں الکٹران کے عمل پر روشنی ڈالی۔ مزید انہوں نے زیادہ انرجی والے الکٹران اور پازیٹران کے مادہ کے اندر گزرنے کے عمل کا اور الکٹران جوڑوں (الکٹران اور پازیٹران) کے وجود میں آنے کے عمل کا بھی مطالعہ کیا۔

1938 میں بھابھا نے کائناتی ذرات میں پائے جانے والے زیادہ وزنی بھاری الکٹران، جن کو بعد میں میوان (Muons) کہا گیا، کا جائزہ لیا۔ بعد کی ریسرچ میں انہوں نے آئنسٹائن کے نظریہ اضافیت (theory of relativity) کے حق میں زیادہ انرجی کی طبیعات سے دلیلیں بھی فراہم کیں۔ وہ کیپٹزا کلب کے ممبر بھی بن گئے جہاں ہر ہفتہ وہ اپنے تجربات بیان کرتے تھے۔

کائناتی شعاعوں (Cosmic rays) میں ان کی ریسرچ کو دنیا نے پہچانا اور 1940 میں ان کو انگلینڈ کی رایل سوسائٹی کا فیلو چن لیا گیا اور اس اعزاز کے وقت ان کی عمر صرف 31 سال تھی۔ ہومی بھابھا وہ پہلے ماہر طبیعیات تھے جنھوں نے الکٹران پازیٹران کے ٹکرانے کے عمل کو جس کو بھابھا ٹکراؤ (Bhabha scattering) عمل بھی کہا جاتا ہے، سمجھا اور اس کے متعلق فارمولے لکھے۔

ہومی بھابھا نے اپنی کیسکیڈ تھیوری (cascade theory) کو اس طرح سمجھایا۔ جب ایک زیادہ انرجی والا الکٹران مادہ سے ہو کر گزرتا ہے تو ایک یا ایک سے زیادہ گاما شعاعوں کے ذرات وجود میں آتے ہیں۔ آگے چل کر ان میں سے ہر ایک الکٹران پازیٹران جوڑا بناتا ہے اور

پھر وہ اسی طرح آگے چل کر پھر اس عمل کو پہلے کی طرح مزید جاری رکھتے ہیں یہاں تک کہ ساری انرجی ختم ہوجاتی ہے۔ اس نظریے کو کیسکیڈ تھیوری، یا کیسکیڈ بوچھار (cascade shower) تھیوری کہتے ہیں۔

انہوں نے ایسے کائناتی ذرات کو بھی کھوج نکالا جن میں اس وقت تک کے علوم ذرات سے سکیڑوں گنا زیادہ انرجی پائی جاتی تھی۔ اپنی اس کھوج کا اعلان انہوں نے ستمبر 1952 میں اسٹاک ہوم میں منعقد بین الاقوامی ٹیکنیکل کانفرنس میں بھی کیا۔

ہومی بھابھا نے 17 سال سے لے کر 29 سال تک اپنی نوجوانی کے تیرہ سال یورپ میں بہت کچھ سیکھتے ہوئے گزارے تھے اور انہوں نے سائنس اور ٹیکنالوجی کی وجہ سے وہاں پیدا ہوئی خوشحالی کو بھی پوری طرح دیکھا تھا۔ پھر بھی ان کو اپنی مادر وطن سے بہت لگاؤ تھا اور یہ جذبہ بھی زور پر تھا کہ اپنے ملک میں سائنسی ترقی کو بڑھاوا دے کر یہاں پر بھی وہی خوشحالی پیدا کر سکیں۔

ہومی بھابھا کو علم ریاضی بہت عزیز تھا اور وہ اس علم کی اندرونی خوبصورتی سے بخوبی واقف تھے ۔ بھابھا اور ہریش چندر نے مل کر کسی فیلڈ میں موجود بنیادی ذرات (point particles) پر تحقیقاتی کام کیا۔ جب ایک پروٹان نیوٹران میں تبدیل ہوتا ہے تو برقی چارج ایک تھوڑے سے والیوم کے اندر میزان (meson field) فیلڈ کی شکل میں بنٹ جاتا ہے ۔ برقی چارج ایک نقطہ پر ہی پایا جاتا ہے ۔ زیادہ انرجی والے نیوٹران یا پروٹان (دونوں کو ملا کر نیوکلیان کہتے ہیں) کے نیوکلیس (Nucleus) سے زیادہ انرجی سے ٹکرانے پر مزید بنیادی ذرات وجود میں آتے ہیں۔ اس تھیوری کو آئنسٹائن کے نظریہ اضافیت کے دائرہ کے اندر رہ کر مکمل کیا گیا۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد ہومی بھابھا کے ذہن میں یہ بات صاف ہوگئی تھی کہ ہندوستان کی صنعت، معاشیات اور ملک کی ترقی کے لیے توانائی (بجلی وغیرہ) کی پیداوار کی مانگ میں زبردست اضافہ ہوگا اور پرانے اور روایتی طریقوں سے بجلی کی پیداوار کافی نہیں ہوگی۔

بھابھا اس بات پر پورا یقین رکھتے تھے کہ اس زبردست مانگ کا جواب یا حل ان ایندھنوں سے پیدا کی ہوئی نیوکلیائی طاقت کے استعمال میں ہے جو ہندوستان ہی میں موجود ذرائع۔ یورینیم اور تھوریم کی بنیاد پر پیدا ہوسکے۔ وہ اس سے بھی بخوبی واقف تھے کہ اس میں بنیادی طور پر بہت سرمایہ لگانا پڑے گا لیکن انھیں اس کا بھی یقین تھا کہ شروع کی دشواریوں کے مقابلے میں لمبی مدت کے جو فائدے اس سے ملیں گے وہ کہیں زیادہ قابل قدر ہوں گے۔

ہومی بھابھا کو اس بات کا بھی یقین تھا کہ ہندوستانی خود اپنے ری ایکٹرس بنانے کی لیاقت رکھتے ہیں۔ ظاہر ہے اس میں ریسرچ اور تعمیری کام کی ضرورت ہوگی۔ اس لیے ایک ایسا مرکز ابھارنا بھی ضروری ہے جہاں ملک کے بہترین سائنسی ذہن مل کر اس کام میں لگ جائیں۔

اٹامک انرجی

1945 میں ٹاٹا انسٹی ٹیوٹ آف فنڈمنٹل ریسرچ، بنیادی طور پر بھابھا کی ہی لگن اور کوششوں سے قایم ہوا تھا۔ انھیں جے۔ آر۔ ڈی۔ ٹاٹا کی حمایت حاصل تھی جو "سردوراب جی ٹاٹا ٹرسٹ" سے بڑا گہرا تعلق رکھتے تھے۔ اس ادارے کو ہندوستان کی سب سے بڑی لیبوریٹری میں تبدیل کردینے کا سہرا بھابھا کے سر ہی ہے۔ اس کا نمبر اٹامک انرجی اسٹیبلشمنٹ کے بعد سب سے اوپر آتا ہے۔

یہ انسٹی ٹیوٹ شروع میں "انڈین انسٹی ٹیوٹ آف سائنس" بنگلور کے ساتھ ہی تھا لیکن بعد میں دسمبر 1945 میں بمبئی منتقل ہوگیا۔ اب یہ بمبئی کے جنوبی آخری سرے پر بحیرہ عرب کے کنارے 2,50,000 مربع فٹ کے علاقے میں ایک خوبصورت ڈیزائن کی بلڈنگ میں آباد ہے۔ بھابھا یہ چاہتے تھے کہ ٹاٹا انسٹی ٹیوٹ آف فنڈمنٹل ریسرچ خود انتہائی معیاری ہو اور اس کے مقرر کیے ہوئے معیار بھی اعلیٰ ترین درجے پر ہوں۔

ہومی بھابھا نے دوسرے ملکوں سے مشہور ومعروف سائنس دانوں کو بلایا تاکہ وہ ہندوستانی سائنس دانوں کے ایک گروپ کو "کاسمک ریز" (کائناتی شعاعیں) جیوفزکس اور

میتھمیٹکس میں بنیادی ریسرچ کی تربیت دیں۔

انھی کی تحریک پر "انڈین اٹامک ایکٹ" پاس ہوا اور 1948 میں اٹامک انرجی کمیشن قایم ہوا۔ وہ یہ بات پوری طرح سمجھ گئے تھے کہ جدید تہذیب کی سب سے پہلی ضرورت توانائی (انرجی) کی بھرپور فراہمی ہے۔ "فاسل فیول" (زمین سے نکلنے والا تیل) جو آگے چل کر بہت پریشانیاں پیدا کرنے والا تھا اس سے وہ بے چین تھے۔ مقدار اور جگہ (جہاں یہ موجود ہو) دونوں صورتوں میں یہ بہت محدود ہے۔ اس لیے ہندوستان کے لیے ایٹمی توانائی پیدا کرنا لازمی ہے۔ ان کی رائے تھی کہ ایٹمی توانائی سے پیدا کی ہوئی بجلی کی لاگت پرانے روایتی تھرمل سٹیشنوں سے پیدا کی جانے والی بجلی کی لاگت کے برابر ہی رہے گی۔ اٹامک انرجی کا ڈپارٹمنٹ 1954 میں قایم کیا گیا، جس کے سکریٹری ہومی بھابھا تھے۔ اس شعبے کو جو کام سونپا گیا وہ یہ تھا کہ اٹامک انرجی کی توانائی کو بجلی کی طاقت پیدا کرنے کے ایک ذریعے کے طور پر استعمال کیا جائے۔ اسی شعبے کو اٹامک انرجی کے استعمال کو زراعت، صنعت اور میڈیسن کی طرف موڑنے کا کام بھی دیا گیا تھا۔

اس سلسلے کا ایک اہم قدم کچھ بعد میں یعنی 1967 میں ٹرامبے میں ایک ریسرچ اور ترقیاتی (ڈولپمنٹ) سنٹر قائم کرنے کا تھا۔ بعد میں اس سینٹر کا نام بھابھا اٹامک ریسرچ سنٹر (BARC) رکھ دیا گیا۔ وزیر اعظم اندرا گاندھی نے اس طرح ملک کی طرف سے بھابھا کو خراج عقیدت پیش کیا۔

ملک کا اٹامک انرجی پروگرام بھی بھابھا کی نگرانی اور سرپرستی میں تیار کیا گیا تھا۔ انھوں نے سب سے پہلے اٹامک سائنس دانوں کا ایک ایسا بنیادی گروپ تشکیل کیا جنھیں ہندوستان کے سب سے پہلے ریسرچ ری ایکٹر کے لیے ساز و سامان اور کل پرزوں کا ڈیزائن تیار کرنے اور بنانے کی ٹریننگ دی گئی۔ بھابھا کی سرپرستی میں ہندوستان کا سب سے پہلا ری ایکٹر "اپسرا" 1956 میں کام کرنے لگا۔

1963 میں یو۔ ایس۔ اے کے ساتھ بمبئی کے پاس تارا پور میں 380 MW کا ایک نیوکلیر پاور اسٹیشن تعمیر کرنے کے لیے ایک معاہدے پر دستخط ہوئے۔ یہ اپنے دیسی ذرائع کی

بنیاد پر نیوکلیر توانائی پروگرام کو تیزی سے آگے بڑھانے کے منصوبے کی طرف پہلا قدم تھا۔ مستقبل میں نیوکلیائی توانائی کے مختلف استعمالوں پر پورا یقین ہونے کی وجہ سے ہومی بھابھا نے اس سلسلے میں ریسرچ میں مختلف شاخیں بھی نکالیں اور انہیں وسعت بھی دی تاکہ اسے مختلف قسم کے پرامن استعمالوں اور سہولتوں کے لیے کارگر بنایا جاسکے۔

"اپسرا" کو اس سلسلے کا سب سے اہم سنگ میل کہا جاسکتا ہے کیونکہ BARC کا ڈیزائن کیا ہوا اور تعمیر کیا ہوا ہندوستان میں یہ پہلا ری اکٹر ہے۔

جب کسی ایٹم کا نیوکلیس ٹوٹتا ہے تو اس کے ٹکڑے زیادہ انرجی رکھنے کی وجہ سے بہت رفتار کے ساتھ نکلتے ہیں۔ اس لیے ان ٹکڑوں کی حرکتی توانائی "کیٹک انرجی" (Kinetic energy) بہت زیادہ ہوتی ہے اور مادہ سے ٹکراتے ہی یہ حرکتی توانائی تھرمل انرجی میں بدل کر گرمی پیدا کرتی ہے۔ نیوکلیس کے ٹوٹنے پر پیدا ہونے والی انرجی کو اٹامک انرجی کہتے ہیں اور اس کو کارآمد بنانے کے لیے نیوکلیر ری ایکٹر میں زنجیری رد عمل (Chain reaction) کو قابو میں کرنا پڑتا ہے۔ بے قابو زنجیری رد عمل کے ذریعہ تباہ کن ایٹم بم بھی بنائے جاسکتے ہیں۔

زنجیری رد عمل کو مندرجہ ذیل طریقہ پر سمجھا جاسکتا ہے۔

ایندھن گریڈ کا یورینیم نیوکلیس جب ایک نیوٹران سے ٹکراتا ہے تو وہ ٹوٹ جاتا ہے۔ اس عمل کو فشن (Fission) کہتے ہیں۔ ٹوٹتے وقت مزید نیوٹران بھی نکلتے ہیں جو پھر دوسرے یورینیم ایٹم کے نیوکلیس سے ٹکرا کر ان کو بھی توڑ دیتے ہیں اور اس طرح یہ عمل بڑھتا چلا جاتا ہے۔ اس لیے اس کو زنجیری نیوکلیائی عمل کہتے ہیں۔ اگر اس کو بے قابو طور پر بڑھنے دیا جائے تو سارا یورینیم ایک دم سے اس زنجیری عمل کی زد میں آکر ایٹم بم کی شکل اختیار کرلے گا۔ اگر اس کو قابو میں کرلیا جائے۔ جیسے نیوکلیر ری ایکٹر میں کرتے ہیں، تو اس سے بجلی بنا کر اسے کام میں لاسکتے ہیں۔

ہندوستان میں بھابھا اٹامک ریسرچ سینٹر نے اس طرح کے ریسرچ ری ایکٹر بنانے میں پہل کی۔ نیوکلیائی ری ایکٹر کے اندر ایندھن کے جگہ ایندھن گریڈ کا یورنیم جسے یورینیم 235

کہتے ہیں۔ ماڈریٹر (moderator) کے ساتھ استعمال کیا جاتا ہے۔ بھاری پانی والے ری ایکٹر کے اندر بھاری پانی کو ماڈریٹر کی شکل میں استعمال کیا جاتا ہے۔

ترقی کے لیے

جواہر لال کی رہنمائی اور سرپرستی میں ہندوستان کی جو پالیسی تیار کی گئی تھی اس میں اٹامک انرجی کو خالص پرامن استعمال کے لیے بڑھایا جانا تھا۔ ہومی بھابھا بھی اس رائے سے پوری طرح اتفاق رکھتے تھے کہ ہندوستان کو اپنی ایٹمی صلاحیت کو خالص پرامن استعمال کے لیے ترقی دینا چاہیے۔ انھوں نے ایک بار اخبار کے ایک رپورٹر سے کہا تھا۔ "ہم اپنے ذرائع کو سرے سے ختم نہیں کردینا چاہتے۔"

ہومی بھابھا کی رائے تھی کہ ایٹم بم صرف سول انجنیرنگ میں استعمال ہونے کے لیے بننے چاہئیں۔ زمین میں اسٹور کرنے (احتیاط سے جمع کرنے) کے لیے گڑھے کھودنے، بندرگاہیں اور نہریں بنانے کے لیے۔ 1955 میں انھوں نے یونائیٹڈ نیشنس کی جینیوا میں منعقدہ "ایٹم فار پیس (Atom for peace) کانفرنس" (امن کے استعمال کے لیے ایٹم) کی صدارت کی۔ اور پھر 63-1960 میں وہ "انٹرنیشنل یونین آف پیور اینڈ اپلائڈ فزکس" کی میٹنگوں کے صدر رہے۔ جینوا کی کانفرنس کے بعد ایک بین الاقوامی اٹامک ایجنسی تشکیل دی گئی۔ اس کا صدر دفتر ویانا میں تھا۔ اس کی سائنٹفک اڈوائزری (مشاورتی) کمیٹی کے بھابھا ممبر تھے اور اپنے انتقال تک اس کے ممبر رہے۔ بھابھا ہندوستانی کابینہ کی سائنٹفک اڈوائزری (مشاورتی) کمیٹی کے ممبر بھی تھے اور ہندوستان کے خلائی (اسپیس) پروگرام کی تشکیل میں بھی بڑی بنیادی حیثیت رکھتے تھے۔ انھوں نے وکرم سارا بھائی کی نگرانی میں "انڈین نیشنل کمیٹی فار اسپیس (خلائی) ریسرچ" کی تشکیل میں بھی پوری مدد کی۔ تھرواننتھا پورم کے پاس "تھمبا ایکویٹوریل راکٹ لانچنگ اسٹیشن" اور "انڈین اسپیس اینڈ سائنس ٹیکنالوجی سینٹر" بھی اسی زمانے میں قایم ہوئے۔ بھابھا گورنمنٹ کی الیکٹرانک کمیٹی کے بھی چیئرمین مقرر ہوئے۔

بھابھا کے کارناموں اور سائنسی کاموں کے اعتراف میں انھیں دنیا کے مختلف ملکوں۔

یو۔ ایس۔ اے۔ یو۔ کے۔ (برطانیہ) وغیرہ سے بہت سے اعزازات اور انعامات ملے۔ انھیں امریکن اکاڈمی آف آرٹس اینڈ سائنسز کا اعزازی فیلو بنایا گیا۔ لندن کی رایل سوسائٹی کا فیلو منتخب کیا گیا (1941)۔ پھر یہ اعزاز ایڈنبرگ نے بھی عطا کیا (1957)۔ یو۔ ایس۔ نیشنل اکاڈمی آف سائنسز کی فیلو شپ (1959) اور گون و لے اینڈ سائنس کالج کی فیلو شپ حاصل ہوئی۔ 1942 میں انھیں ایڈمس پرائز ملا۔ یہ نیویارک اکاڈمی آف سائنس کے اعزازی حیاتی رکن 1963 میں بنائے گئے۔ ان قابل قدر اعزاز واکرام کے ساتھ انھیں بہت سی یونیورسٹیوں نے ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری دی۔ پٹنہ (1944)، لکھنؤ (1949)، بنارس (1950)، آگرہ (1952)، برتھ (1954)، الہ آباد (1958)، کیمبرج (1959) اور لندن (1960)۔

1954 کے صدر جمہوریہ نے انہیں پدم بھوش سے نوازا۔ جب لال بہادر شاستری وزیر اعظم ہوئے تو انھوں نے کابینہ میں بھابھا کو وزارت اٹامک انرجی اور سائنٹفک ریسرچ کا پورٹ فولیو پیش کیا مگر بھابھا کی روح میں جو سائنس داں تھا اس نے انہیں صرف اٹامک انرجی کمیشن کا صدر ہی رکھنا مناسب سمجھا۔

آرٹسٹ

بھابھا کا کردار اس وقت تک پورا ہی نہیں ہوتا جب تک ان کی آرٹ اور موسیقی جیسے فنون لطیفہ سے گہری دلچسپی کا ذکر نہ کیا جائے۔ آرٹ کا یہ شوق ان میں بہت شروع سے تھا اور کم عمری میں ہی بمبئی میں آرٹ کلاسوں میں حاضری اور پھر لندن میں کی ہوئی پینٹنگوں سے شروع ہوا تھا۔ وہ پینٹنگ کے ایک مکمل اور ماہر آرٹسٹ تھے۔ یہ اپنے فن کو چہروں یا جسموں کی پینٹنگ کے بعد منظر کشی (لینڈ اسکیپ) اور پھر تجریدی (ابسٹریکٹ) آرٹ کی طرف منتقل کرتے چلے گئے۔ انھوں نے ایک زمانے میں چہرے (پورٹریٹس) بنانے کا فن بھی اپنایا۔ ملک کے آرٹ کے یہ بہت بڑے قدردانوں اور مربیوں میں سے تھے۔

بہت نرم گفتار اور مکمل اور دیدہ زیب لباس پہننے والے اس خوبصورت سائنٹسٹ کا محبوب مشغلہ اچھی موسیقی سننا تھا۔ کچھ عرصے یہ کمپوزر، (موسیقی کی دھنیں بنانے والے) بننے

کے خواب بھی دیکھتے رہے تھے۔ سترہ سال کی عمر میں ہی یہ مغربی کلاسیکی موسیقی سے اچھی واقفیت رکھتے تھے۔ اور اپنے والد کی جمع کی ہوئی بہترین کتابوں اور موسیقی کے رکارڈوں کی مدد سے ان دونوں فنون لطیفہ کا بڑا ستھرا شوق ان میں پیدا ہو چکا تھا۔ انہیں ہندوستانی کلاسیکی موسیقی اور کلاسیکی رقص سے بھی لگاؤ تھا۔ ہومی بھابھا کو آرٹ کے فن کی حسیت (احساس) قدرت نے غیر معمولی حد تک عطا کیا تھا اور موسیقی میں بھی ان کا رجحان اور دلچسپی اتنی ہی سنجیدگی لیے ہوئے تھی جتنی اس میں گہرائی اور ادراک تھا۔

ٹاٹا انسٹی ٹیوٹ آف فنڈ منٹل ریسرچ کا طرز تعمیر (ارکٹیکچر) اس کے ارد گرد کے منظر (لینڈ اسکیپ) اس کے لانس میں پھولوں کی روشیں، یہ سب بھابھا کے رنگوں کے چناؤ اور ان کی حسیت، ہر چیز کی ظاہری شکل وصورت کی نفاست کا خیال اور ان کے اپنے پورے کردار کی گواہ ہیں۔ وہ جس جگہ جو چیز موجود ہے، اسی کی مدد سے "لینڈ اسکیپ" ابھارنے میں یقین رکھتے تھے۔ ہومی بھابھا کا مقصد سائنس کو اپنے ہی ملک میں موجود ذرائع کی مدد سے زندگی کے ایک طریقے کے طور پر ابھارنا تھا۔ اپنے ماضی میں جو کچھ بھی اچھا اور عظیم تھا اسے ساتھ لیتے ہوئے ایک ایسی سائنس کو پھیلانا جس میں ہماری روایات کے نقوش بھی موجود ہوں اور ہندوستان کے لوگوں کا کلچر اور قدرت کے عطیے، سب کی جھلک نظر آتی ہو۔

24 جنوری 1966 کو اس جہاز میں ان کی موجودگی جو مونٹ بلینک کی پہاڑیوں میں ہوائی حادثے کا شکار ہوا ان کے پروگرام میں بالکل آخری منٹ پر ایک تبدیلی کا نتیجہ تھی۔ ویسے ان کی سیٹ 22 جنوری کے لیے بک تھی۔ بھابھا کی موت ایسا نقصان ہے جس کا ازالہ ممکن نہیں ہے۔ ہندوستان انہیں ہمیشہ یاد رکھے گا چونکہ ملک کی قسمت اور اس کی سوسائٹی کی بناوٹ اور معیار میں تبدیلی پیدا کرنے میں ان کی ذات کا بڑا گہرا تعلق ہے۔